گلدستۂ ادب

مولفۂ

پنڈت منوہر لال زتشی ایم-اے

آئی-سی-ایس

باہتمام کالی کے مترا-پرنٹر و پبلشر

انڈین پریس لمیٹڈ

الہ آباد

گلدستۂ ادب

مؤلفہ

پنڈت منوہر لال زتشی۔ ایم۔ اے

آئی۔ ئی۔ ایس

انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد

سنہ ۱۹۳۰ء

میں ان سب بزرگوں کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے
نہایت دریا دلی سے مجھ کو اپنی تصانیف سے یا ایسی تصانیف سے جو
اُن کے قبضہ میں تھیں انتخاب کرنے کی اجازت دی۔

حضرت شبلی نعمانی کا میں خصوصاً شکر گذار ہوں۔ جناب ممدوح نے
نہ صرف اپنی شایع شدہ تصانیف سے انتخاب کرنیکی اجازت دی بلکہ شعر العجم
کی چوتھی جلد شائع ہونے کے قبل اسکا پروف مجھ کو بھیج دیا اور اسمیں سے
جو مضامین میں چاہتا تھا اُن کو اخذ کرنیکی اجازت عطا فرمائی۔

منوہر لال زتشی

فہرست مضامین

نثر

نمبر مضمون	مضمون	صفحہ
	میرامن	۱
۱	انتخاب از باغ و بہار	۲
	مرزا رجب علی بیگ سرور	۱۸
۲	لکھنؤ (ماخوذ از فسانۂ عجائب)	۱۹
	مرزا اسد اللہ خاں غالب	۲۷
۳	رقعات غالب	۳۰
	شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد	۵۲
۴	زبان اردو کی تاریخ (ماخوذ از آب حیات)	۵۶
۵	برج بھاشا پر عربی و فارسی زبانوں نے کیا کیا اثر کئے۔ (ماخوذ از آب حیات)	۸۹
۶	محمد شاہ کا زمانہ اور نادر شاہ کا آنا (ماخوذ از قصص ہند حصہ دویم)	۱۳۸
	سر سید احمد خاں	۱۵۸

نمبر مضمون	مضمون	صفحہ
۷	رسم و رواج (ماخوذ از تہذیب الاخلاق)	۱۵۹
۸	خوشامد 〃	۱۶۶
۹	سویلیزیشن یا تہذیب 〃	۱۷۰
۱۰	اپنی مدد آپ 〃	۱۷۷
	شمس العلما مولانا شبلی نعمانی	۱۸۹
۱۱	شاعری (ماخوذ از شعر العجم جلد ۴)	۱۹۰
	پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی	۲۲۰
۱۲	تاریخ (ماخوذ از رسالہ تہذیب)	۲۲۲
	نظم	
	مرزا محمد رفیع سودا	۲۴۳
۱	غزلوں کا انتخاب	۲۴۶
	مخمس شہر آشوب	۲۴۷

نمبر مضامین	مضمون	صفحہ
	میر تقی میر	۲۵۱
۳	غزلوں کا انتخاب	۲۵۳
	خواجہ حیدر علی آتش	۲۵۷
۴	غزلوں کا انتخاب	۲۵۸
	مرزا اسد اللہ خاں غالب	
۵	غزلوں کا انتخاب	۲۶۵
۶	قصائد کا انتخاب	۲۶۹
۷	آم کی تعریف	۲۷۳
۸	غالب اور ذوق کے سہرے	۲۷۴
۹	معذرت از مرزا غالب	۲۷۷
	میر ببر علی انیس	۲۷۸
۱۰	مناجات	۲۸۱
۱۱	صبح کی بہار	۲۸۳
۱۲	گرمی کی شدت	۲۸۵
۱۳	گھوڑے کی تعریف	۲۸۶
۱۴	شمشیر آبدار	۲۸۷
۱۵	تلوار کا کاٹ	۲۸۸
۱۶	مسافرت	۲۸۹
۱۷	عجز و انکسار	۲۹۰
۱۸	اولاد	۲۹۱
۱۹	رباعیات	۲۹۳
	شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی	۲۹۶
۲۰	مرثیہ غالب	۲۹۷
۲۱	چپ کی داد	۳۰۴
	ڈاکٹر محمد اقبال ایم۔اے	۳۱۳
۲۲	ہمارا دیس	۳۱۴
۲۳	جگنو	۳۱۵
۲۴	نیا شوالہ	۳۱۶
	پنڈت برج نرائن چکبست	
۲۵	غزلوں کا انتخاب	۳۱۸
۲۶	رامائن کا ایک سین	۳۱۹
۲۷	دولت	۳۲۵

میر امّن دہلوی

ان کے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سلطنت مغلیہ کے دامن سے وابستہ رہے۔ سلطنت مذکور کے زوال کے بعد جب دلّی کے گرد و نواح میں جاٹوں کا عمل ہو گیا تو ان کی موروثی جاگیریں ضبط ہو گئیں، اور احمد شاہ ابدالی کے تاخت و تاراج کے زمانہ میں اُن کا گھر بھی لٹ گیا۔ مجبوراً میر امّن نے دہلی چھوڑ کر پورب کا رُخ کیا اور کچھ روز عظیم آباد (پٹنہ) میں قیام کر کے کلکتہ پہونچے۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں کلکتہ کے مشہور قلعہ فورٹ ولیم میں سرکار انگریزی کی طرف سے ایک کالج اُن انگریزوں کی تعلیم کی غرض سے قائم کیا گیا تھا جو ولایت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہو کر ہندوستان آیا کرتے تھے۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں لارڈ ولزلی نے گل کرائسٹ صاحب کو اس کالج کا پرنسپل مقرر کیا۔ صاحب موصوف کو ہندوستانی زبان کی تدوین کا خاص شوق تھا۔ چنانچہ انھوں نے نہ صرف خود اس زبان کی گرامر اور ڈکشنری تیار کی بلکہ اپنی نگرانی میں کئی ایک قابل مصنّفوں سے ہندی اور اُردو نثر میں کتابیں لکھوائیں۔ سید محمد حیدر بخش حیدری مصنف طوطا کہانی۔ میر شیر علی افسوس مترجم باغ اردو۔ مصنف آرائش محفل منشی اکرام علی مترجم اخوان الصفا۔ سری للو لال جی کوی مصنف پریم ساگر اسی فورٹ ولیم کی انجمن کے برگزیدہ ارکین ہیں۔ سنہ ۱۸۰۱ء میں میر امّن نے اس

بزمِ سخن میں داخل ہو کر باغ و بہار کے نام سے چہار درویش کا قصہ آراستہ کیا۔ باغ و بہار کی زبان بامحاورہ صاف اور سلیس ہے اور اُس زمانہ کی نثر کی تصنیفات میں اس کا رتبہ اعلیٰ ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح اُردو نظم کی پیدائش کا فخر دکن اور اس کی نشو و نما اور ترقی کا فخر دلّی اور لکھنؤ کو حاصل ہے اسی طرح اُردو اور ہندی نثر کی تدوین اور ترتیب پر کلکتہ اگر چاہے تو ناز کر سکتا ہے کیونکہ اس سے پہلے صرف ایک کتاب دہ مجلس حامی محمد شاہ کے عہد میں ایک بزرگ فضلی تخلص نے اُردو نثر میں لکھی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب دلّی اور لکھنؤ کے اہلِ قلم اردو لکھنا عار سمجھتے تھے۔ اور علم ادب کی تصانیف تو درکنار معمولی خط و کتابت بھی اس زبان میں نہیں کرتے تھے۔ ہم کو میر امّن اور ان کے ہم جلیسوں کا ممنون ہونا چاہئے کہ جنھوں نے آج سے سو برس پہلے اُردو نثر کی پرورش اور پرداخت کر کے اسمیں علمی زبان بننے کی صلاحیت پیدا کی۔

انتخاب از باغ و بہار

منشا اس تالیف کا یہ ہے کہ سن ایک ہزار دو سو پندرہ برس ہجری
اور اٹھارہ سو ایک سال عیسوی مطابق ایک ہزار دو سو سات سن فصلی
کے عہد میں اشرف الاشراف مارکوئس ولزلی گورنر جنرل لارڈ مارنگٹن صاحب
کہ جن کی تعریف میں عقل حیران اور فہم سرگرداں ہے۔ جتنے وصف سرداروں
کو چاہئے اُس ذات میں خُدا نے جمع کئے ہیں۔ غرض قسمت کی خوبی
اس مُلک کی تھی جو ایسا حاکم تشریف لایا جس کے قدم کے فیض سے
ایک عالم نے آرام پایا۔ مجال نہیں کہ کوئی کسی پر زبردستی کر سکے۔ شیر
اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ سارے غریب اور غُربا دعا دیتے

ہیں۔اور جلتے ہیں۔چرچا علم کا پھیلا۔صاحبان ذیشان کو شوق ہوا کہ اردو کی زبان
سے واقف ہوکر ہندوستانیوں سے گفت وشنود کریں اور ملکی کام کو
باآگاہی تمام انجام دیں۔اس واسطے کتنی کتابیں اسی سال بموجب
فرمایش کے تالیف ہوئیں۔جو صاحبِ دانا اور ہندوستان کی زبان
بولنے والے ہیں،اُن کی خدمت میں گذارش کرتا ہوں کہ یہ قِصّہ
چار درویش کا ابتدا میں امیر خسرو دہلوی نے اس تقریب سے کہا
کہ حضرت نظام الدین رح اولیا زری زر بخش جو اُن کے پیر تھے اور درگاہ
اُن کی دلّی میں قلعے سے تین کوس لال دروازے کے باہر مٹیا
دروازے سے آگے لال بنگلے کے پاس ہے۔اُن کی طبیعت
ماندی ہوئی تب مُرشد کا دل بہلانے کے واسطے،امیر خسرو قصّہ ہمیشہ
کہتے اور تیمار داری میں حاضر رہتے۔اللہ نے چند روز میں شفا
عنایت کی۔تب اُنھوں نے غسل صحت کے دن یہ دُعا دی
کہ جو کوئی اس قِصّے کو سنے گا خُدا کے فضل سے تندرست رہیگا۔
جب سے یہ قصّہ فارسی، مروّج ہوا۔ اب صاحبِ ثروت
ذی شان نجیبوں کے قدردان جان گلکرسٹ صاحب نے اِس
ہیچمدان سے ازراہ مہربانی کے فرمایا کہ اِس قِصّے کو ٹھیٹھ ہندوستانی
گفتگو میں جو اُردو کے لوگ ہندو مسلمان عورت مرد لڑکے بالے خاص و عام

آپسمیں بولتے ہیں ترجمہ کرو موافق حکم حضور کے میں نے بھی اِسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے پہلے اپنا احوال یہ عاصی گنہگار میرامن دلی والا بیان کرتا ہے کہ میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کی عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پُشت در پُشت جانفشانی بجالاتے رہے اور وہ بھی پرورش کی نظر سے قدردانی جتنی چاہئے فرماتے رہے۔ جاگیر و منصب اور خدمات کی عنایت سے سرفراز کرکے مالامال اور نہال کر دیا اور خانہ زاد موروثی و منصب دار قدیمی زبان مبارک سے فرمایا۔ چُنانچہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا۔ جب ایسے گھر کی کہ سارے گھر اس گھر کے سبب آباد تھے۔ یہ نوبت پہونچی کہ ظاہر ہے۔ عیاں را چہ بیان تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا اور احمد شاہ دُرانی نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی ایسی تباہی کھا کر اُسی شہر سے کہ وطن اور جنم بھوم میرا ہے اور آنول ونال وہیں گڑا ہے جلاوطن ہوا اور ایسا جہاز کہ جس کا ناخُدا بادشاہ تھا غارت ہوا۔ میں بیکسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہے۔ کِتنے برس بلدہ عظیم آباد میں دم لیا۔ کچھ بنی کچھ بگڑی وہاں سے بھی پاؤں اُکھڑے۔ روزگار نے موافقت نہ کی۔ عیال و اطفال کو چھوڑ کر تنہا کشتی پر سوار ہوا۔ اشرف البلاد کلکتہ میں آب و دانے کے زور سے آپہونچا۔ چندے بیکاری میں گُذرے اِتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے

چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا۔ قریب دوسال کے وہاں رہنا ہوا لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا تب منشی میر بہادر علی کے وسیلے سے حضور تک جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جوان مرد کا دامن ہاتھ لگا ہے چاہئے کہ دن کچھ بھلے آویں نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھاکر پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش پاکر دعا اس قدرداں کو کرتے ہیں۔ خدا قبول کرے۔

حقیقت اُردو کی زبان کی بزرگوں کے مُنہ سے یوں سُنی ہے کہ دلّی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے وہاں کے راجہ پرجا قدیم سے رہتے تھے اور اپنی بھاکھا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا سلطان محمود غزنوی آیا پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے۔ اس آمدورفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی آخر امیر تیمور نے جن کے گھرانے میں اب تک نام نہاد سلطنت چلا آتا ہے ہندوستان لیا اُن کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا۔ اسواسطے شہر کا بازار اُردو کہلایا۔ پھر ہمایوں بادشاہ پٹھانوں کے ہاتھ سے حیران ہو کر ولایت گئے آخر وہاں سے آن کر پسماندوں کو گوشمالی دی کوئی مُفسد باقی نہ رہا کہ فتنہ و فساد برپا کرے۔ جب اکبر شاہ تخت پر بیٹھے

تب چاروں طرف کے مُلکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اِس خاندان لاثانی کی سُن کر حضور میں آکر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جُدی جُدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف سوال وجواب کرتے ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی۔ جب حضرت شاہجہاں صاحب قران نے قلعہ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا اور تخت طاؤس میں جواہر جڑوایا اور دَل بادَل ساخیمہ چوبوں پر استادہ کر طنابوں سے کھنچوایا اور نواب علی مردان خاں نہر کو لیکر آیا تب بادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا اور شہر کو اپنا دارالخلافت بنایا تب شاہجہاں آباد مشہور ہوا۔ اگرچہ دِلّی جُدی ہے وہ پُرانا اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے اور وہاں کے بازار کو اُردو معلّے خطاب دیا امیر تیمور کے عہد سے محمد شاہ کی بادشاہت بلکہ احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کے وقت تک پیڑھی بہ پیڑھی سلطنت یکساں چلی آئی۔ ندان زبان اُردو کی منجتے منجتے ایسی منجی کہ کسو شہر کی بولی اُس سے ٹکر نہیں کھاتی لیکن منصف قدردان چاہئے جواب تجویز کرے سو اب خُدا نے بعد مدت کے جان گلکرسٹ صاحب سا دانا نکتہ رس پیدا کیا۔ کہ جنھوں نے اپنے گیان اور اُکت سے اور تلاش ومحنت سے قاعدوں کی کتابیں تصنیف کیں اِس سبب سے ہندوستان کی زبان کا مُلکوں میں رواج ہوا اور نئے سرے سے رونق زیادہ ہوئی

نہیں تو اپنی دستار و گفتار اور رفتار کو کوئی بُرا نہیں جانتا۔ اگر ایک گنوار سے پوچھیئے تو شہر والے کو نام رکھتا ہے اور اپنے تئیں سب سے بہتر سمجھتا ہے۔ خیر عاقلاں خود میدانند۔ جب احمد شاہ ابدالی کابل سے آیا اور شہر کو لٹوایا۔ شاہ عالم پورب کی طرف تھے کوئی وارث اور مالک مُلک کا نہ رہا۔ شہر بے سر ہو گیا۔ سچ ہے بادشاہ کے اقبال سے شہر کی رونق تھی یکبارگی تباہی پڑی۔ رئیس وہاں کے میں کہیں تم کہیں ہو کر جہاں جس کے سینگ سمائے وہاں نکل گئے جس مُلک میں پہنچے وہاں کے آدمیوں کے ساتھ سنگت سے بات چیت میں فرق آیا اور بہت لیسے ہیں دس پانچ برس کسو سبب سے دلّی میں گئے اور رہے۔ وے بھی کہاں تک بول سکیں گے۔ کہیں نہ کہیں چوک ہی جائینگے اور جو شخص سب آفتیں سہکر دلّی کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پشتیں اُسی شہر میں رہتے گذریں اور اُس نے دربار امراؤں کے اور میلے ٹھیلے عرس چھڑیاں سیر تماشا اور کوچہ گردی اُس شہر کی مدت تک کی ہوگی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا اُسکا بولنا البتہ ٹھیک ہے۔ یہ عاجز بھی ہر ایک شہر کی سیر کرتا تماشا دیکھتا یہاں پہونچا ہے **شروع قصہ چار درویش کا**۔ اب آغاز قصے کا کرتا ہوں ذرا کان دھر کر سُنو اور منصفی کرو سیر میں چار درویش کی یوں لکھا ہے اور کہنے والے نے

کہتا ہے کہ آگے روم کے ملک میں کوئی شہنشاہ تھا کہ نوشیروان کی
سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت اُس کی ذات میں تھی۔ نام اُسکا
آزادبخت اور شہر قسطنطنیہ جسکو استنبول کہتے ہیں اُسکا پایہ تخت تھا۔ اُسکے
وقت میں رعیت آباد خزانہ معمور لشکر مرفہ حال تھا۔ غریب غُربا آسودہ ایسے
چین سے گذران کرتے اور خوشی سے رہتے کہ ہر ایک کے گھر میں دن عید
رات شب برات تھی اور جتنے چور چکار جیب کترے صبح خیزیے اُٹھائی گیرے
دغاباز تھے سب کو نیست نابود کر کے نام و نشان اُن کا اپنے ملک بھر میں
نہ رکھا تھا۔ ساری رات دروازے گھروں کے بند نہ ہوتے اور دکانیں
بازار کی کھلی رہتیں۔ راہی مسافر جنگل میدان میں سونا اُچھالتے چلے جاتے
کوئی نہ پوچھتا کہ تمہارے مُنہ میں کے دانت ہیں اور کہاں جاتے ہو۔ اس
بادشاہ کے عمل میں ہزاروں شہر تھے اور کئی سلطان نعلبندی دیتے۔ ایسی
بڑی سلطنت پر ایک ساعت اپنے دل کو خدا کی یاد اور بندگی سے غافل
نہ کرتا آرام دُنیا کا جو چاہے سب موجود تھا لیکن فرزند کہ جو زندگانی کا پھل
ہے۔ اسکی قسمت کے باغ میں نہ تھا اس خاطر اکثر فکرمند رہتا۔ اور پانچوں
وقت کی نماز اپنے کریم سے کہتا کہ اے اللہ مجھ عاجز کو تو نے اپنی عنایت سے
سب کچھ دیا۔ لیکن ایک اندھیرے گھر کا دیا نہ دیا یہی ارمان جی میں باقی ہے کہ میرا
نام لیوا اور پانی دیوا کوئی نہیں اور تیرے خزانہ غیب میں سب کچھ موجود ہے ایک بیٹا

جیتا جاگتا مجھے دے تو میرا نام اور سلطنت کا نشان قائم رہے۔ اسی امید میں بادشاہ کی عمر چالیس برس کی ہو گئی۔ ایک دن شیش محل میں نماز ادا کر کے وظیفہ پڑھ رہے تھے یکبارگی آئینہ کی طرف خیال جو کرتے ہیں تو ایک سفید بال مونچھوں میں نظر آیا کہ مانند تارِ مقیش کے چمک رہا ہے۔ بادشاہ دیکھکر آبدیدہ ہوئے اور ٹھنڈی سانس بھری پھر دل میں اپنے سوچ کیا کہ افسوس تو نے اپنی عمر ناحق برباد کی اور افسوس اس دُنیا کی حرص میں ایک عالم کو زیر و زبر کیا اتنا مُلک جو لیا اب تیرے کس کام آوے گا۔ آخر یہ سارا مال و اسباب کوئی دوسرا اُڑا دیگا تجھے تو پیغام موت کا آچکا اگر کوئی دن جئے تو بدن کی طاقت کم ہو گی اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میری تقدیر میں نہیں لکھا کہ وارث تاج و تخت کا پیدا ہو۔ آخر ایک روز مرنا ہے اور سب کو چھوڑ جانا ہے اس سے یہی بہتر ہے کہ میں اسے چھوڑ دوں اور باقی زندگی اپنی خالق کی یاد میں کاٹوں۔ یہ بات اپنے دل میں ٹھہرا کر پائیں باغ میں جا کر سب مجرائیوں کو جواب دیکر فرمایا کہ کوئی آج سے میرے پاس نہ آوے سب دیوان عام میں آیا جایا کریں اور اپنے کام میں مستعد رہیں یہ کہکر آپ ایک مکان میں جا بیٹھے اور مصلّے بچھا کر عبادت میں مشغول ہوئے سوائے رونے اور آہ بھرنے کے کچھ کام نہ تھا۔ اسی طرح بادشاہ آزاد بخت کے کئی دِن گذرے شام کو روزہ کھولنے کے وقت ایک چھوارا اور تین گھونٹ

پانی کے پی کر تمام دن رات جاءِ نماز پر پڑے رہتے۔ اس بات کا باہر چرچا پھیلا اور رفتہ رفتہ تمام مُلک میں خبر گئی کہ بادشاہ نے بادشاہت سے ہاتھ کھینچ کر گوشہ نشینی اختیار کی۔ چاروں طرف سے غنیموں اور مفسدوں نے سر اُٹھایا اور قدم اپنی حد سے بڑھایا جس نے چاہا مُلک دبا لیا اور سرانجام سرکشی کا کیا۔ جہاں کہیں حاکم تھے ان کے حکم میں خلل واقع ہوا ہر ایک صوبہ سے عرضی بدعملی کی پہنچی دربار کی اُمراء جتنے تھے سب جمع ہوئے اور صلاح و مصلحت کرنے لگے۔ آخر یہ تجویز ٹھہری کہ نواب وزیر عاقل اور دانا ہے اور بادشاہ کا مقرب اور معتمد ہے اور درجے میں بھی سب سے بڑا ہے۔ اسکی خدمت میں چلیں دیکھیں وہ کیا مناسب جان کر کہتا ہے۔ سب عمدہ امیر وزیر کے پاس آئے اور کہا بادشاہ کی یہ صورت اور مُلک کی وہ حقیقت اگر چندے اور تغافل ہوا تو اس محنت کا مُلک لیا ہوا مفت میں جاتا ہے گا۔ پھر ہاتھ آنا بہت مشکل ہے۔ وزیر پُرانا نمک پروردۂ قدیم نمک حلال اور عقلمند۔ نام بھی خردمند اسم بامسمّٰی تھا بولا کہ اگرچہ بادشاہ نے حضور میں آنیکے واسطے منع کیا ہے لیکن تم چلو میں بھی چلتا ہوں۔ خُدا کرے جو بادشاہ کی مرضی آوے اور روبرو بُلاوے۔ یہ کہکر سب کو اپنے ساتھ دیوان عام تک لایا ان کو وہاں چھوڑ کر آپ دیوان خاص میں آیا اور بادشاہ کی خدمتمیں کہلا بھیجا کہ یہ پیر غلام حاضر ہے۔ کئی دنوں سے جمال جہاں آرا نہیں

دیکھا امیدواریوں ہے کہ ایک نظر دیکھکر قدموسی کروں تو خاطر جمع ہو۔
یہ عرض وزیر کی بادشاہ نے سنی ازبسکہ قدامت اور خیر خواہی اور تدبیر اور
جاں نثاری اسکی جانتے تھے اور اسکی بات مانتے تھے بعد تامّل کے
فرمایا کہ خردمند کو بلا لو۔ بارے جب پروانگی ہوئی وزیر حضور میں آیا آداب
بجالایا اور دست بستہ کھڑا رہا دیکھا تو بادشاہ کی عجب صورت بن رہی ہے
کہ زار زار روتے اور دُبلاپے سے آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں اور چہرہ زرد
ہوگیا ہے خردمند کو تاب نہ رہی بے اختیار دوڑ کر قدموں پر جا گرا بادشاہ
نے ہاتھ سے سر اسکا اٹھایا اور فرمایا تو نے مجھے دیکھا خاطر جمع ہوئی اب جاؤ
زیادہ مجھے نہ ستاؤ تم سلطنت کرو خردمند سُنکر ڈاڑھ مار کر رویا اور عرض کیا غلام
کو آپ کے تصدّق اور سلامتی سے ہمیشہ بادشاہت میسر ہے لیکن جہاں پناہ
کی یک بیک گوشہ گیری سے تمام مُلک میں تہلکہ پڑ گیا ہے اور انجام
اسکا اچھا نہیں۔ یہ کیا خیال مزاج مبارک میں آیا اگر اس خانہ زاد موروثی
کو بھی محرم اس راز کا کیجئے تو بہتر ہے جو کچھ عقل ناقص میں آوے التماس کرے۔
غلاموں کو جو ایسی سرفرازیاں بخشی ہیں اسی دن کے واسطے کہ بادشاہ عیش و
آرام کریں اور نمک پروردے تدبیریں مُلک کی رہیں۔ خدانخواستہ
جب فکر مزاج عالی کے لاحق ہووے تو بندہ ہائے بادشاہی کس کام آویں گے
بادشاہ نے کہا سچ کہتا ہے لیکن جو میری فکر جی کے اندر ہے سو تدبیر باہر ہے

سُن اے خردمند میری ساری عُمر اسی مُلک گیری کے دردسر میں کٹی اَب یہ سن وسال ہوا آگے موت باقی رہی ہے سو اُس کا بھی پیغام آیا کہ سیاہ بال سفید ہو چلے۔ وہ مثل ہے جیسے کسو نے کہا ساری رات سوئے اَب صُبح کو بھی نہ جاگیں۔ اب تک ایک بیٹا پیدا نہ ہوا جو میری خاطر جمع ہوتی۔ اس لئے دل سخت اُداس ہوا اور مَیں سب کچھ چھوڑ بیٹھا جس کا جی چاہے مُلک لے یا مال مُجھے کچھ کام نہیں بلکہ کوئی دن میں یہ ارادہ رکھتا ہوں کہ سب چھوڑ چھاڑ کر جنگل اور پہاڑوں میں نکل جاؤں اور منہ اپنا کسو کو نہ دکھاؤں۔ اسی طرح چند روز زندگی بسر کروں۔ اگر کوئی مکان خوش آیا تو وہاں بیٹھکر اپنے معبود کی بندگی بجالاؤں گا۔ شاید عاقبت بخیر ہو اور دُنیا کو تو خوب دیکھا مزہ نہ پایا اِتنی بات بول کر اور ایک آہ بھر کر بادشاہ چُپ ہوئے۔ خردمند اُن کے باپ کا وزیر تھا۔ جب یہ شاہزادے تھے تب سے محبت رکھتا تھا علاوہ اس کے دانا اور نیک اندیش تھا۔ کہنے لگا خُدا کی درگاہ سے نااُمید ہونا ہرگز مناسب نہیں۔ جس نے ہیژدہ ہزار عالم کو ایک حکم سے پیدا کیا تُمھیں اولاد دینی اُس کے نزدیک کیا بڑی بات ہے۔ قبلہ عالم اس تصور باطل کو دل سے دور کریں نہیں تو تمام عالم درہم برہم ہو جائیگا اور یہ سلطنت کس کس محنت اور مشقت سے تمہارے بزرگوں نے اور تم نے پیدا کی ہے ایک ذرے میں ہاتھ

سے نکل جائے گی اور بے خبری سے ملک ویران ہو جاویگا خدانخواستہ
بدنامی حاصل ہوگی۔ اس پر بھی بازپرس روزِ قیامت کے ہوا چاہیے کہ
تجھے بادشاہ بنا کر اپنے بندوں کو تیرے حوالے کیا تھا تو ہماری رحمت سے
مایوس ہوا اور رعیت کو پریشان کیا۔ اس سوال کا کیا جواب دوگے۔
پس عبادت بھی اُس روز کام نہ آوے گی اس واسطے آدمی کا دل خُدا
کا گھر ہے اور بادشاہ فقط عدل کے واسطے پوچھے جاویں گے۔ غلام کی
بے ادبی معاف ہو گھر سے نکل جانا اور جنگل جنگل پھرنا کام جوگیوں اور فقیروں
کا ہے نہ کہ بادشاہوں کا۔ تم اپنے طور کا کام کرو خُدا کی یاد اور بندگی جنگل اور
پہاڑوں پر موقوف نہیں۔ آپ نے یہ بیت سُنی ہوگی **شعر**

خدا اس پاس یہ ڈھونڈتے جنگل میں ڈھنڈھورا شہر میں لڑکا بغل میں

اگر منصفی فرمائیے اور اس فدوی کی عرض قبول کیجئے تو بہتر یوں ہے کہ جہان
پناہ ہر دم اور ہر ساعت دھیان اپنا خُدا کی طرف لگا کر دُعا مانگا کریں۔ اسکی
درگاہ سے کوئی محروم نہیں رہا دن کو بندوبست مُلک کا اور انصاف عدالت
غریب غربا کی فرماویں تو بندے خُدا کے دامنِ دولت کے سائے میں امن و
امان خوش گذران رہیں اور رات کو عبادت کیجئے اور درود پیغمبر کی روح پاک کو نیاز کر کر
درویش گوشہ نشین متوکلوں سے مدد لیجئے اور روزاتب یتیم اسیر عیال داروں
محتاجوں اور رانڈ بیواؤں کو کر دیجئے۔ ایسے اچھے کاموں اور نیک نیتوں کی

برکت سے خدا چاہے تو امید قوی ہے کہ تمہارے دل کے مطلب اور مقصد سب پورے ہوں اور جس واسطے مزاج عالی مکدر ہو رہا ہے وہ آرزو برآوے اور خوشی خاطر شریف کو ہو جائے پروردگار کی عنایت پر نظر رکھئے کہ وہ ایک دم میں جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ بارے خردمند وزیر کی ایسی ایسی عرض معروض کرنے سے آزاد بخت کے دل کو ڈھارس بندھی فرمایا اچھا تو جو کہتا ہے بھلا یہ بھی کر دیکھیں۔ آگے جو اللہ کی مرضی ہوگی سو ہوگا۔ جب بادشاہ کے دل کو تسلی ہوئی تب وزیر سے پوچھا کہ اور سب امیر دبیر کیا کرتے ہیں اور کس طرح ہیں۔ اُس نے عرض کی کہ سب ارکانِ دولت قبلۂ عالم کی جان و مال کو دعا کرتے ہیں آپ کی فکر سے سب حیران و پریشان ہو رہے ہیں جمال مبارک اپنا دکھائیے تو سب کی خاطر جمع ہووے چنانچہ اس وقت دیوان عام میں حاضر ہیں۔ یہ سن کر بادشاہ نے حکم کیا انشاء اللہ تعالیٰ کل دربار کروں گا سب کو کہدو حاضر رہیں۔ خردمند یہ وعدہ سن کر خوش ہوا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا دی کہ جب تک یہ زمین و آسمان برپا ہیں تمہارا تاج و تخت قائم رہے۔ اور حضور سے رخصت ہو کر ہنسی خوشی باہر نکلا اور یہ خوشخبری امراؤں سے کہی سب امیر ہنسی خوشی سے گھر کو گئے۔ سارے شہر میں آنند ہو گئی رعیت پرجا مگن ہوئے کہ کل بادشاہ دربار عام کرے گا۔ صبح کو سب خانہ زاد

اعلیٰ ادنیٰ اور ارکانِ دولت چھوٹے بڑے اپنے اپنے پائے اور مرتبے
پر آ کھڑے ہوئے اور منتظرِ جلوۂ بادشاہی کے تھے جب پہر دن چڑھا یکبارگی
پردہ اُٹھا اور بادشاہ نے برآمد ہو کر تخت مبارک پر جلوس فرمایا نوبت خانے
میں شادیانے بجنے لگے سبھوں نے نذریں مبارکبادی کی گذرانیں اور
مُجرے گاہ میں تسلیمات و کورنشات بجالائے موافق قدر و منزلت کے ہر
ایک کو سرفرازی ہوئی۔ سب کے دِل کو خوشی اور چین ہوا جب دوپہر
ہوئی برخاست ہو کر اندر محل داخل ہوئے خاصہ نوش جان فرما کر
خوابگاہ میں آرام کیا اُس دن سے بادشاہ نے یہی مقرر کیا کہ ہمیشہ
صُبح کو دربار کرنا اور تیسرے پہر کتاب کا شغل یا درود وظیفہ پڑھنا
اور خُدا کی درگاہ میں توبہ استغفار کر کر اپنے مطلب کی دُعا مانگنی۔
ایک روز کتاب میں بھی لکھا دیکھا کہ اگر کسی شخص کو غم یا فکر ایسی لاحق
ہو کہ اس کا علاج تدبیر سے نہ ہو سکے تو چاہئے کہ تقدیر کے حوالے
کرے اور آپ گورستان کی طرف رجوع کرے درود طفیل پیغمبر کی روح
کے اُن کو بخشے اور اپنے تئیں نیست و نابود سمجھ کر دل کو اس غفلت
دُنیاوی سے ہشیار رکھے اور عبرت سے روئے اور خُدا کی قدرت
کو دیکھے کہ مجھ سے آگے کیسے کیسے صاحب مُلک اور خزانہ اِس
زمین پر پیدا ہوئے۔ لیکن آسمان نے سب کو اپنی گردش میں

لاکر خاک میں ملا دیا یہ کہاوت ہے۔

دوہرہ

چلتی چکی دیکھکر دیا کبیرا روئے   دو پاٹن کے بیچ آ ثابت بچا نہ کوئے

اب خود دیکھئے سوائے ایک مٹی کے ڈھیر کے اُن کا کچھ نشان باقی نہیں
ہیں اور سب دولت دُنیا گھربار آل اولا آشنا دوست نوکر چاکر ہاتھی
گھوڑے چھوڑکر اکیلے پڑے ہیں یہ سب ان کے کچھ کام نہ آیا بلکہ اب کوئی
نام بھی نہیں جانتا کہ یہ کون تھے اور قبر کے اندر کا احوال معلوم نہیں
کہ کیڑے مکوڑے چونٹے سانپ ان کو کھا گئے یا اُن پر کیا بیتی اور خدا
سے کیسی بنی۔ یہ باتیں اپنے دل میں سوچکر ساری دُنیا کو سُپنے
کا کھیل جانے تب اس کے دل کا غنچہ ہمیشہ شگفتہ رہے گا کسو حالت
میں پژمُردہ نہ ہوگا یہ نصیحت جب کتاب میں مطالعہ کی بادشاہ کو خردمند
وزیر کا کہنا یاد آیا اور دونوں کو مطابق پایا یہ شوق ہوا کہ اس پر عمل کروں
لیکن سوار ہوکر اور بھیڑ بھاڑ لے کر بادشاہوں کیطرح سے جانا اور پھرنا
مناسب نہیں۔ بہتر یہ ہے لباس بدل کر رات کو اکیلے مقبروں میں
یا کسی مرد خُدا گوشہ نشین کی خدمت میں جایا کروں اور شب بیدار رہوں
شاید ان مردوں کے وسیلے سے دُنیا کی مُراد اور عافیت کی نجات
میسر ہو یہ بات دل میں مقرر کر کے ایک روز رات کو موٹے جھوٹے

کپڑے پہن کر کچھ روپے اشرفی لے کر چپکے قلعے سے باہر نکلے
اور میدان کی راہ لی۔ جاتے جاتے ایک گورستان میں پہونچے نہایت
صدق دل سے درود پڑھ رہے تھے اور اُس وقت بادِ تند
چل رہی تھی بلکہ آندھی کہنا چاہئے یکبارگی بادشاہ کو دور سے ایک
شعلہ سا نظر آیا مانند صُبح کے تارے کے روشن ہے دِل میں اپنے
خیال کیا کہ اس آندھی اور اندھیرے میں یہ روشنی خالی حکمت سے
نہیں یا یہ طلسم ہے کہ اگر پھٹکری اور گندھک کو چراغ میں بتی کے
آس پاس چھڑک دیجئے تو کیسی ہی ہوا چلے چراغ گل نہ ہوگا یا کسو ولی
کا چراغ ہے کہ جلتا ہے جو کچھ ہو سو ہو چل کر دیکھنا چاہئے۔ شاید اس
شمع کے نور سے میرے بھی گھر کا چراغ روشن ہو اور دل کی مراد ملے
یہ نیت کر کے اُس طرف کو چلے جب نزدیک پہونچے دیکھا کہ چار
فقیر بینوا کفنیاں گلے میں ڈالے اور سر زانو پر دھرے عالم بیہوشی میں خاموش
بیٹھے ہیں۔ جیسے کوئی مسافر اپنے قوم اور ملک سے بچھڑ کر بیکسی اور مفلسی کے
رنج و غم میں گرفتار ہو کر حیران رہجاتا ہے اسی طرح سے یہ چاروں نقش دیوار
ہو رہے ہیں اور ایک چراغ پتھر پر دھرا ٹمٹما رہا ہے ہرگز ہوا اس کو نہیں
لگتی گویا فانوس اس کی آسمان بنا ہے کہ بے خطرے جلتا ہے آزادبخت
کو دیکھتے ہی یقین آیا کہ مقرر تیری آرزو ان مردان خدا کے قدم کی برکت

سے برآوے گی اور تیری اُمید کا سوکھا درخت ان کی توجہ سے ہرا ہو کر
پھلے گا۔ ان کی خدمت میں چل کر اپنا احوال کہہ اور مجلس کا شریک
ہو شاید تجھ پر رحم کھا کر دُعا کریں جو بے نیاز کے یہاں قبول ہو یہ ارادہ
کر کر چاہا کہ قدم آگے دھرے وہیں عقل نے سمجھایا کہ اے بیوقوف جلدی
نہ کر ذرا دیکھ لے تجھے کیا معلوم ہے کہ یہ کون ہیں اور کہاں سے آئے
ہیں اور کدھر جاتے ہیں کیا جانے یہ دیو ہیں یا غول بیابانی ہیں کہ
آدمی کی صورت بن کر باہم مل بیٹھے ہیں بہرصورت جلدی کرنا اور
اُن کے درمیان جا کر مخل ہونا خوب نہیں ابھی ایک گوشہ میں
چھپ کر حقیقت ان درویشوں کی جاننا چاہئے۔ آخر بادشاہ نے یہی
کیا کہ ایک کونہ میں اُس مکان کے چپکا جا بیٹھا کہ کسو کو اُس کے آنکی
آہسٹ کی خبر نہ ہوئی اپنا دھیان ان کی طرف لگایا کہ دیکھئے آپس میں
کیا بات چیت کرتے ہیں اتفاقاً ایک فقیر کو چھینک آئی شکر خدا کا کیا
وہ تینوں قلندر اُس کی آواز سے چونک پڑے چراغ کو اُسکایا ٹھیک
تو روشنی کتی اپنے اپنے بستروں پر حقے بھر کر پینے لگے ایک اُن آزادوں
میں سے بولا کہ یاران ہمدرد و رفیقان جہاں گرد ہم چار صورتیں آسمان
کی گردش سے اور لیل ونہار کے انقلاب سے در بدر خاک بسر الک مدت
پھرے الحمدللہ کہ طالع کی مدد اور قسمت کی یاوری سے آج اس مقام پر باہم ملاقات

ہوئی اور کل کا احوال کچھ معلوم نہیں کیا پیش آوے۔ ایک سنگ رہیں یا جُدا جُدا ہو جاویں رات بڑی پہاڑ ہوتی ہے ابھی سے پڑ رہنا خوب نہیں اِس سے یہ بہتر ہے کہ اپنی اپنی سرگذشت جو اس دُنیا میں جس پر بیتی ہو بشرطیکہ جھوٹ اُس میں کوڑی بھر نہ ہو بیان کرے تو باتوں میں رات کٹ جائے جب تھوڑی شب باقی رہے تب لوٹ پوٹ رہیں گے سبھوں نے کہا یا ہادی جو کچھ ارشاد ہوتا ہے ہم نے قبول کیا۔ پہلے آپ ہی اپنا احوال جو دیکھا ہے شروع کیجئے تو ہم بھی مستفید ہوں۔

مرزا رجب علی بیگ سرور

مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنؤ میں پیدا ہوئے آپ صاحبِ دیوان تھے اور شاعری میں آغا نوازش حسین خاں نوازش کے شاگرد تھے لیکن انکی شہرت زیادہ تر ان کی نثر نگاری کی بنا پر ہے۔ علاوہ فسانۂ عجائب کے جو اپنے خاص رنگ میں ان کی بہترین تصنیف ہے۔ شگوفۂ محبت اور گلزارِ سرور۔ دو اور قصے ان سے یادگار ہیں۔ سرورِ سلطان ترجمۂ شمشیر خانی بھی انھیں کی تالیف ہے تذکرہ ڈی تاسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۴۲ء تک لکھنؤ میں رہے ایک اور تذکرہ سے معلوم ہوا کہ ۱۸۶۲ء میں کلکتے

گئے تھے وہاں سے واپس آکر تھوڑے ہی دنوں بعد لکھنؤ میں انتقال کیا۔ فسانۂ عجائب نثر کی اُس طرز تحریر کا اعلیٰ نمونہ ہے جس کی بنا تصنع اور بناوٹ پر ہے اور جکی دلاویزی کا مدار مصنوعی حُسن پر ہے ایک زمانہ میں اُردو کے انشاپردازوں میں یہ طرز نہایت مقبول تھا مگر اب کچھ تو غالب اور آزاد کی تقلید اور کچھ انگریزی تہذیب کے اثر سے لوگوں نے اس کو ترک کردیا ہے تاہم فسانۂ عجائب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کا انشاپرداز اس رنگ میں بھی کیا کیا رنگینیاں پیدا کرسکتا ہے گو اسی کے ساتھ یہ بات بھی اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس طرز کا میدان کسقدر تنگ ہے اور زمانہ حال کی دوادوش کے لئے کس قدر ناقابل ہے۔

لکھنؤ

ماخوذ از فسانۂ عجائب

یہ ہیچمدان محرر داستان مقلد گذشتگان رجب علی بیگ سرور متوطن خطۂ بے نظیر دلپذیر رشک جناں مسکن حور غلماں جائے مردم نیز باشندہ یہاں کے ذکی فہیم عقل کے تیز۔ اگر دیدۂ انصاف و نظر غور سے اس شہر کو دیکھئے تو جہان کی دید کی حسرت نہ رہے آنکھ بند کرلے **شعر**

سُنا رضواں بھی جسکا خوشہ چیں ہے ۔۔۔ وہ بیشک لکھنؤ کی سرزمیں ہے

سبحان اللہ وبحمدہ عجیب شہر گلزار ہے ہر گلی کوچہ دلچسپ باغ وبہار ہے
ہر شخص اپنے طور پر قطعدار ہے دو رویہ بازار کس انداز کا ہے ہر دُکان میں تا آ
تازہ ونیاز کا ہے ہر چند ہر محلّے میں جہاں کا ساز وسامان مہیا ہے پر اکبری دروازے
سے جلو خانے اور پکّے پل تک کہ صراط مستقیم ہے کیا جلسہ ہے نان بائی
خوش سلیقہ شیرمال کباب نان نہاری جہاں کی نعمت اس آبداری کی
جس کی بو باس سے دل طاقت پائے دماغ معطر ہو جائے فرشتہ گذرے
تو سونگھے کیسا ہی سیر ہو ذرہ نہ دیر ہو دیکھے سے بھوک لگ آئے وہ سرخ
سرخ پیاز سے نہاری کا بگھار سریلی جھنکار شیرمال شگوفے کی نان کی خستہ بھربھری
ایک بار کھائے نان نعمت کا مزہ پائے تمام عمر ہونٹ چاٹتا رہ جائے
کباب اس آب وتاب کے کہ مرغ ماہی کا دل بیچ آئے پوست سرخی
سے کباب ادرک کا لچھہ میاں خیر اللہ کی دکان کا کہ ایسا شیرمال باریک نانبائی
حیدری کے حلوا سوہن پر عجیب جوبن اس کی شیرینی کی گفتگو میں لب
بند جہاں کو پسند پڑے دبیز لیے لبائے ہونٹ سے کھائے دانت
کا تمام عمر اس پر دانت رہے لگانے کی نوبت نہ آئے جوڑی خوب
حبشی اہل ہند کو مرغوب دودھیا شیر خوارہ نوش کر جائے ہر کبیرن
کی وہ تیکھی چتون آدمی صورت دیکھتا رہے رعب حسن سے بات
نہ کر سکے پری زاد سرو قامت رشک شمشاد کانوں میں انواع اقسام کے

میوے قرینے سے چُنے روزمرے محاورے اُن کے دیکھے نہ سُنے کبھی
کوئی پُکار اُٹھی میاں ٹکے کہ ڈھیر لگا دیا ہے کوئی موزوں طبیعت یہ فقرہ
سُناتی مزہ انگور کا ہے رنگتروں میں کسی طرف یہ صدا آتی گنڈیریاں پونڈے
کی ایک طرف تنبولی سُرخروئی سے یہ رمز و کنایہ کرتے بولی ٹھولی میں
چبا چبا کر ہر دم یہ دم بھرتے مکھی کا مُنہ کالا ہو باگر د کر ڈالا عبیر ہے نہ
گلال ہے کتھے چونے سے اودھی میں مکھڑا لال ہے گلیوں میں گجردم
یہ آواز آتی شیرمال ہے گھی اور دودھ کی مفلس کا دِل اُچاٹ ہے
ٹکوں کی چاٹ ہے کدھر لینے والے ہیں نمش کی قُلفیاں کیسر کے
پیالے ہیں کیا خوب بھنے بھر بھرے ہیں چنے پر تل اور مُرمُرے ہیں
جیٹھ بیساکھ کی گرمی جس میں تیل انڈا چھوڑتی دو پیسے کو برف کی قُلفی
جمی دو کھائے بدن تھرائے زیادہ ہو کا کرے لقوے فالج میں مرے
ہر چوک ہمیشہ شانے سے شانا چھلا نسیم صبا کو سد معار استہ بلاتیخ کولی
کی مٹھائی جس نے کھائی جہان کی شیرنی سے دِل کھٹا ہوا بنارس کا
کھجلا پھولا متھرا کے پیڑے کا کھٹا ہوا برفی کی نفاست بو باس
در در اپنی لقریق ورق کا جوبن کسی اور شہر کا رکابدار اگر دیکھ پائے یا
ذائقہ لب پر آئے زندگی تلخ ہو ہاتھ کاٹ کر کاٹ کر کھا امرتی مُسلسل کا
ہر پیچ ذائقہ کو پیچ و تاب دیتا یاقوتی مفرح کا مزا جب منہ میں رکھا اصل

تو یہ ہے عسلِ مصفیٰ جنت کی نہر کا حلق سے اُترا بالائی جس دُکان پر نظر آئی بے قند و شکر شکر کر چھری سے کاٹ کر کھائی مدارئے حُقّے وہ ایجاد ہوئے کسگرا ایسے اُستاد ہوئے کہ جب تڑاقا اُن کا سُنلیہ حیوان کا دم بند ہوا۔ برسات کے موسم میں شہر کا یہ عالم ہے ادھر مینہ برسا پانی جابجا بہ گیا گلی کوچہ صاف رہ گیا ساون بھادوں میں زردوزی جوتا پہن کر پھرے کیچڑ تو کیا مٹی نہ بھرے باغ بہار کی صنعت پروردگار کی رضوان جن کا شائق دیکھنے کے لائق روز عیش باغ میں تماشے کا میلا ہر وقت چین کا جلسہ موتی جھیل کا پانی چشمہ زندگانی کی آب و تاب دکھاتا پیاسوں کا دل لہراتا سڑک کے درختوں کی فضا جدھا کھجوا موجیں مارتا ہار سنگار کے جنگل میں لوگوں کا جم گھٹا باغ میں کوئل پپیہے مور کا شور جھولے پر کھٹاری اور بھی گھنگھور ساون بھادوں کے جھالے وہ رنگین جھولنے والے دشت غربت میں یہ جلسہ جو یاد آجاتا ہے دل پاش پاش ہوتا ہے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ نہ کہ کانپور کی برسات ہیہات ہیہات دخل کیا دروازے سے باہر قدم دھرے اور کیسل نہ پڑے گلی میں پاؤں گھا کیچڑ کا چھپکا مہ پہ ہو نجادوا اس فصل میں باہم نہ دیکھے مگر چھلے کے پھنسے اور جنھیں سواری کا مقدور نہیں دخل

سلہ۔ نام چشمہ ہا۔

کیا جو وہ جائیں کہیں اُن کے حق میں برسات حوالات گھرجیلخانہ
کہیں جانا نہ آنا اگر خواب میں کہیں نکل گئے تو چونک پڑے کہ بھول گئے
اور جو بازاری کاریاری ہیں اُن کا یہ نقشہ دیکھا ہاتھ میں جوتیاں پائینچا
چڑھا کیچڑ میں لت پت یہاں گرے وہاں گرے خدا خدا کر جیتے گھر پھرے
اور جو شیخی کے مارے ننگے پاؤں نہ نکلے تو شعر

دیکھی ہے یہ رسم اس نگر میں جوتا ہے گلی میں آپ گھر میں

پھر بر سر مطلب آیا خاص بازار شہر وسیع و خوش قطع ہے اُس کے
نقشے سے مانی و بہزاد نے خار کھایا ہے شبیہ کشی تو کیا خاکا خاک نہ کھینچا
ہاتھ تھرایا ہے کوٹھیاں فرح بخش و دلکشا برج ہر ایک جہاں نما
سلطان منزل اور راحت بخش نشاط افزا تو بہ شکن انسان کو دیکھکر سکتا
ہو جائے کام اُن کا وہم و قیاس میں نہ آئے سر راہ کی بارہ دری جواہر
سے جڑی پری کی صورت کی قریب نہر جاری تکلف کی تیاری پائیں
باغ اُس کا جس نے دیکھا باغ ارم سمجھا سوسن نمط ہزار باتیں بہم پہنچیں
تعریف نہ کرسکا گونگے کا سپنا ہوا رومی دروازہ اس رفعت و شان
کا ہے گزر گاہ ایک جہان کا ہے اگر اُس پر چڑھ جائے بام فلک پست
معلوم ہو فرشتوں کا مشورہ کان میں آئے سہرا ولین اُسکی زمین ہے
شش جہت میں دوسرا نہیں ہے مسجد انتخاب ہے امام باڑہ لاجواب ہے

مقبرے عالیشان وہ اور مکان کہ فلک بدیدۂ انجم نگراں ہے اُن کی نظیر
کی جستجو میں مشعل مہ و خورشید روز و شب روشن کئے تو بکو سرگرداں ہے
اگر پاؤں پھیلانے کی جگھ اُن میں ہاتھ آئے سرِ دست جانے کو جی
چاہے گومتی کے انداز سے نہر کی کیفیت نظر آتی ہے طبیعت لہراتی ہے
دو رویہ آبادی عمارت کہیں رمنے کسی جا باغ بنے صبح و شام وہ بہار
نظر آتی ہے کہ شام اودھ اور بنارس کی سحر بھول جاتی ہے شہر نفیس
مجمع رئیس ہر فن کا کامل یہاں حاصل ہے خوشنویس حافظ ابراہیم صاحب
سا اس قطع کا قطعہ لکھا جو میر علی یا آغا جیتے ہوتے اپنے لکھے کو روتے
اشک حسرت سے وصلیاں دھوتے مرزائی صاحب کا یہ حال تھا
کوئی پرچہ ان کا اُن کی نظر پڑ جاتا بزیر بزیر بزیر بر کتنا یاقوت رقم میرا
کھاتا مرثیہ خواں میر علی صاحب نے وہ طرزِ نو مرثیہ خوانی کا ایجاد
کیا کہ چرخ کہن نے مسلم الثبوت اُستاد کیا علم موسیقی میں یہ کمال
بہم پہونچایا اس طرح کا دُھرپت خیال ٹپہ گایا اور بنایا کہ کبھی کسی کے
وہم و خیال میں نہ آیا تھا ایک رنگیں احاطہ کھینچا ہے جو اُس میں
آیا پھولا پھلا وہ اُن کا پیرو ہوا اور جس نے ڈھنگ جدا کیا وہ ٹکسال
باہر بدرنگ ہوا اگر تانسین جیتا ہوتا ان کے نام پہ کان پکڑتا بھیک
مانگ کھاتا مگر نہ گاتا امیروں میں حسین علی خاں بُلبل ہزار داستاں

خوش الحان مرثیہ گو بے نظیر میاں دلگیر صاف باطن نیک ضمیر خلیق فصیح مرد مسکین مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا اللہ کے کرم سے ناظم خوب دبیر مرغوب سکندر طالع بصورت گدا بار احسان اہل دول کا نہ اُٹھایا عرصہ قلیل میں مرثیہ سلام دیوان کثیر فرمایا۔ طبیب ہر ایک مسیحائی کرتا ہے قم باذنی کا دم بھرتا ہے جسے دیکھا بقراط سقراط جالینوس زماں ہے اس معنی میں یہ خطہ رشک زمین یونان ہے۔ میر کی جان صاحب پڑھنے کے فن سے ایسے آشنا ہوئے کہ مردم بر و بحر سرگرم ثنا ہوئے شاعر زبان داں ایسے کہ عرفی اور خاقانی کی غلطی بتائی فردوسی و انوری کی یاد بھلائی شیخ امام بخش ناسخ نے یہ ہندی کی چندی کی اور روزمرہ کو ایسا فصیح و بلیغ کیا کہ کلام سابقین منسوخ ہوا فصحائے شیراز و اصفہان اس سیف زبان کا لوہا مان گئے اپنے قبح پر منفعل ہوئے اس زبان کا حسن جان گئے زمین شعر کو آسمان پر پہونچایا سیکڑوں کو اُستاد بنایا خواجہ حیدر علی کی آتش بیانی شرر افشانی سے دل جلوں کے سینہ میں سوز و گداز ہے مرد قانع شاعر ممتاز ہے۔ فرنگی محل کا حال کیا لکھوں کہاں زبان و دست کا یارا جو شمہ لکھتا مولوی فاضل عدیم المثال ہر شخص جمیع علوم کا اُستاد کتب درسی ابتدا سے انتہا تک یاد منقول و معقول میں دقیقہ باقی نہ رہا ریاضی کے ریاض سے آسمان کو زمین

کردیا مولوی انوار کا پرتو فیض جہاں میں روشن مولوی مبین دور بین
سراج انجمن مولوی ظہور اللہ سبحان اللہ ایسے محقق کہاں ہوتے ہیں یہی
لوگ نادر الزماں ہوتے ہیں اُدھر رکن دین بلا کد میر سید محمد مجتہد مرزا
کاظم علی متقی آخون محمد رضا رضائے خدا کا جویا حامل قرآن ہمہ داں کسی
علم میں عاری نہیں روئے زمین پر آقا محمد تبریزی سا قاری نہیں
مشائخ فقیروں کے مزار خوب خواب راحت میں آسودہ سالک و مجذوب
شاہ مینا شاہ پیر محمد شاہ خیر اللہ ایک سے ایک سبحان اللہ بظاہر مردہ بحقیقت
میں جیتے ہیں اشیائے لطیف کھاتے پیتے ہیں مولوی عبد الرحمن برگزیدۂ
یزداں عالم باعمل درویش کامل خواجہ باسط اور میر نصیر جن کا عدیل نہ
نظیر خواجہ حسین وحسن سرکردۂ انجمن طبیعت بسکہ معروف بہ اختصار
ہے ایک ایک فقرہ لکھا ہے وگرنہ ان بزرگواروں کی صفت میں
کتابیں تحریر کرے تو بجا ہے مگر شعر

کار دنیا کسے تمام نہ کرد ہر چہ گیرید مختصر گیرید

میرزا اسد اللہ خاں غالب

پیدائش آگرہ ۱۷۹۶ء — وفات دلّی ۱۸۶۹ء

میرزا غالب کے آبا و اجداد ایبک قوم کے ترک تھے۔ ان کے دادا شاہ عالم کے زمانہ میں دلّی آئے اور شاہی دربار میں ملازم ہو گئے جس وقت مرزا کی عمر پانچ برس کی تھی اس وقت ان کے والد الور میں کسی لڑائی میں مارے گئے۔ ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کے صوبہ دار تھے۔ انھوں نے مرزا کو باپ کے مرنے کے بعد پرورش کیا۔ چچا کے مرنیکے بعد سرکار انگریزی سے کچھ پنشن مقرر ہوگئی شادی ہونے کے بعد مرزا غالب نے آگرہ چھوڑ کر دلّی میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور یہیں ۷۲ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ مولوی محمد حسین آزاد نے تاریخ کہی۔ آہ غالب بمرد۔ مرزا کو فارغ البالی کبھی نصیب نہ ہوئی۔ ساری عمر تنگدستی اور مفلوک الحالی میں گذری چنانچہ ایک دوست کو جس نے نظام دکن کے لئے قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی تھی، لکھتے ہیں۔ ۵ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا۔ ۹ برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض میں میرے اور میرے شرکاء حقیقی کے واسطے شامل

جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے۔ اُنھوں نے نہ دئے مگر تین ہزار روپیہ سال ان میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپیہ سال فقط۔ میں نے سرکار انگریزی میں غبن ظاہر کیا۔ کولبروک صاحب بہادر رزیڈنٹ دہلی اور استرلنگ بہادر سکتر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ رزیڈنٹ معزول ہو گئے۔ سکتر گورنمنٹ بمرگ ناگاہ مر گئے۔ بعد ایک زمانہ کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرر کیا۔ ان کے ولیعہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بصلہ مدح گستری ۵سو روپیہ سال مقرر ہوئے وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جئے یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی دو ہی برس میں ہوئی۔ دلّی کی سلطنت کچھ سخت جاں تھی ۷ برس مجھکو روٹی دیکر بگڑی ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں"۔

مرزا غالب فارسی کی نظم و نثر کے مسلم الثبوت اُستاد ہیں فارسی زبان سے ان کو قدرتی لگاؤ ہے چنانچہ خود ان کا قول ہے کہ فارسی سے مجھے مناسبت ازلی ہے یہی وجہ ہے کہ اُردو میں اکثر فارسی کے الفاظ اس طرح ترکیب دیجاتے ہیں جو اردو والوں کو غیر مانوس اور غیر سلیس معلوم ہوتے ہیں۔ مزید براں یہ کہ معنی آفرینی اور

نازک خیالی اُن کی مشکل پسند طبیعت کا خاص جوہر تھا۔اسی وجہ سے اُن کا شروع کا اُردو کا کلام جو بیدل کے رنگ میں ہے نہایت پیچیدہ اور مشکل ہے خواجہ حالی اس زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے یادگار غالب میں فرماتے ہیں کہ "خود مرزا کی زبانی سُنا گیا ہے کہ میر تقی نے جو مرزا کے ہموطن تھے ان کے لڑکپن کے اشعار سُن کر یہ کہا تھا کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد مل گیا اور اُس نے اس کو سیدھے راستہ پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بنجائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا" لیکن کچھ تو خود اپنی طبع سلیم کے تقاضے اور کچھ دوستوں کی روک ٹوک سے مرزا نے اپنے اُردو کلام میں سے دو ثلث کے قریب نکال ڈالا اور اس کے بعد اس روش پر چلنا چھوڑ دیا۔ مرزا کے اس آخری انداز کلام میں فصاحت اور بلاغت کی خوبیاں اس شان سے فراہم ہوئی ہیں کہ کمال سخن کی مثال اس سے بہتر ذہن میں نہیں آسکتی۔جب یہ صاحب کمال خارسیّت کو چھوڑ کر سہل ممتنع پر آجاتا ہے تو روانی اور سلاست کے دریا بہا دیتا ہے۔ اور تصوّف کی چاشنی تو جس قدر مرزا غالب کے مختصر دیوان میں ہے اُس سے زیادہ کسی اُردو شاعر کے یہاں نہیں۔

مرزا کے کمال کی ایک تخصیص اور ہے جو اُردو کے کسی اور صاحب کمال کو نصیب نہیں۔وہ یہ کہ جس طرح ان کا پایہ نظم میں عالی

ہے اسی طرح یہ اُردو نثر میں طرز نوی کی موجد ہیں، اور طرّہ یہ کہ انھوں نے نثر میں کوئی کتاب نہیں لکھی۔ اُردوے معلی محض خطوں اور رقعوں کا مجموعہ ہے جس کو لوگ عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں، مرزا نے القاب آداب کا پُرانا اور فرسودہ طریقہ قطعی اُڑا دیا وہ خط کے شروع میں کبھی میاں کبھی برخوردار کبھی بھائی صاحب کبھی مہاراج، یا اور کوئی مناسب لفظ لکھ دیتے ہیں اور بس۔ ادائے مطلب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے دو آدمی بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور شوخی تحریر ان سب پر طرّہ ہے بقول خواجہ حالی "اگرچہ مرزا کے بعد نثر اردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے علمی اخلاقی پولیٹکل سوشل اور مذہبی مضامین کے لوگوں نے دریا بہادئے ہیں بائیوگرافی اور ناول میں بھی متعدد کتابیں نہایت ممتاز لکھی گئی ہیں باوجود اس کے مرزا کی تحریر خط کتابت کے محدود دائرے میں بلحاظ دلچسپی اور لطف بیان کے اب بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی"۔

رقعات غالب
منشی ہرگوپال تفتہ کے نام

صاحب تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا۔ وہ ایک

جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے شعر کہے دیوان جمع کئے۔ اُسی زمانہ میں ایک بزرگ تھے کہ ہمارے تمہارے دوست دلی تھے اور منشی نبی بخش اُن کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا اُس کا جواب مجھکو آیا اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں اُس کا نام دلی اور اُس محلہ کا نام بلیماروں کا محلہ ہے لیکن ایک دوست اُس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر کیا غریب کیا اہل حرفہ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔ اب پوچھو کہ تو کیونکر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا۔ صاحب بندہ میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بدیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والئے پٹیالہ کے۔ راجہ نے صاحبان عالیشان سے عہد لے لیا تھا کہ بر وقت غارت دلی یہ لوگ بچ رہیں چنانچہ بعد فتح راجہ کے سپاہی

یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں مبالغہ نہ جاننا۔ امیر و غریب سب نکل گئے جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار۔ پنشندار۔ دولتمند۔ اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس دار و گیر میں مبتلا ہیں مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے اور ہنگامے میں شریک ہو رہے ہیں۔ میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کے اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہی اس کو نوکری سمجھو۔ خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی، لہذا طلبی نہیں ہوئی ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں میری کیا حقیقت تھی۔ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے، رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون جو آوے گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔

کچھ نیک و بد کا حال مجکو نہیں معلوم بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکّام کو توجہ بھی نہیں۔ دیکھئے انجام کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہئے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔ بہر حال منشی صاحب کو میرا سلام کہنا اور یہ خط دکھا دینا اس وقت تمہارا خط پہونچا اور اُسی وقت مَیں نے یہ خط لکھکر ڈاک کے ہرکارہ کو دیا۔

ایضاً

کیوں صاحب روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی؟ اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ مَیں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا مَیں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا کہ جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہ آ رہتے ہوں۔ بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے ایک دو صبح کو اور ایک دو شام کو میری دلگی ہو جاتی ہے۔ دن اُن کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گذر جاتا ہے۔ یہ کیا سبب دس دس بارہ بارہ دن سے تمہارا خط نہیں آیا۔ یعنی تم نہیں آئے خط لکھو۔ صاحب نہ لکھنے کی وجہ لکھو آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو۔

غالب۔ سوموار۔ ۷۔ دسمبر ۱۸۵۸ء

ایضاً

مہاراج آپ کا مہربانی نامہ پہونچا۔ دل میرا اگرچہ خوش نہ ہوا۔ لیکن ناخوش بھی نہ رہا۔ بہر حال مجکو کہ نالائق و ذلیل ترین خلائق ہوں اپنا دُعاگو سمجھتے رہو۔ کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روشش ہندوستانی فارسی لِکھنے والوں کی مجکو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کریں۔ میرے قصیدے دیکھو۔ تشبیب کے شعر بہت پاؤگے اور مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفےٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو۔ کہ اُن کی مدح کتنی ہے۔ میرزا رحیم الدین بہادر حیاؔ تخلص کے دیوان کے دیباچہ کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ دیوان حافظ کی بموجب فرمایش جان جاکوب بہادر کے لِکھی ہے۔ اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں اُن کا نام اور اُن کی مدح آئی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی اور مطالب ہیں۔ واللہ باللہ کسی شاہزادے یا امیرزادے کے دیوان کا دیباچہ لِکھتا تو اُس کی مدح نہ کرتا کہ جتنی تمہاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قِصّہ مختصر تمہاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمہارے نام کا بدل کر اس کے عوض ایک فقرہ اور لِکھدیا ہے۔ اس سے زیادہ گنجائش میری روشش میں نہیں۔ ظاہرا تم خود فکر نہیں کرتے اور حضرات کے

پھکا سنے میں آجاتے ہو۔ وہ صاحب تو پیشتر اس نظم و نثر کو مہمل کہیں گے
کس واسطے کہ اُن کے کان اس آواز سے آشنا نہیں جو لوگ کہ قتیل
کو اچھے لکھنے والوں میں جانیں گے وہ نظم و نثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے
ہمارے شفیق منشی نبی بخش صاحب کو کیا عارضہ ہے کہ جس کو تم لکھتے
ہو کہ ماءالجبن سے بھی نہ گیا۔ ایک نسخہ طب محمد حسین خانی میں لکھا ہے :
اور وہ بہت بے ضرر اور بسود مند ہے۔ مگر اثر اس کا دیر میں ظاہر ہوتا ہے۔
وہ نسخہ یہ ہے کہ پانی سات سیر پانی لیویں اور اُس میں سیر پیچھے تولہ بھر
چوب چینی کوٹ کر ملا دیں اور اس کو جوش کریں اس قدر کہ چہارم پانی
جل جاوے پھر اُس باقی پانی کو چھان کر کوری ٹھلیا میں بھر رکھیں
اور جب باسی ہو جائے اُس کو پئیں۔ جو غذا کھایا کرتے ہیں کھایا کریں
پانی دن رات جب پیاس لگے یہی پئیں تبرید کی حاجت پڑے اسی
پانی میں پئیں۔ روز جوش کروا کر چھنوا کر رکھ چھوڑیں۔ برس دن میں اس
کا فائدہ معلوم ہو گا۔ میرا سلام کہکر یہ نسخہ عرض کر دینا آگے اُن کو اختیار ہے۔

چودھری عبدالغفور کے نام

میرے مشفق، آپ کا خط آیا اور اس کے آنے نے تمہاری رنجش کا

وسوسہ میرے دل سے مٹایا۔ ایک قاعدہ آپ کو بتاتا ہوں، اگر اس کو
منظور کیجئے گا تو خطوط کے نہ پہونچنے کا احتمال اُٹھ جائے گا اور رجسٹری
کا دردِ سر جاتا رہے گا۔ آدھ آنہ نہ سہی، ایک آنہ سہی، آپ بھی خط بیرنگ بھیجا
کیجئے اور میں بھی بیرنگ بھیجا کروں۔ پیڈ خطوط تلف بھی ہوتے ہیں۔
اس قاعدہ کا جیسا کہ میں واضع ہوا ہوں، بادی بھی ہوا اور یہ خط بیرنگ
بھیجا۔ پنشن جاری ہو گیا۔ تین برس کا چڑھا ہوا روپیہ مل گیا۔ بعد ادائے
قرض معہ ۱۸۶۰ء بچے۔ اب ماہ بماہ روپیہ ملتا ہے مگر یہ تین مہینے ستمبر، اکتوبر،
نومبر ملیں گے۔ دسمبر ۱۸۶۰ء سے تنخواہ ششماہی ہو جائے گی۔ اس سے
بڑھکر یہ بات ہے کہ چار روپیہ سیکڑہ سالانہ عموماً وضع ہوا کرے گا۔ اس
حساب سے میرے حصہ میں ڈھائی روپیہ مہینہ آیا۔ معہ ۱۸۵۹ء کے سنہ ۱۸۶۰ء
رہیں گے۔ کچھ رام پور سے ماہ بماہ آتا ہے۔ یہ دونوں آمدنیں مل کر خوش
و ناخوش گذارہ ہو جاتا ہے۔ یہاں شہر ڈھ رہا ہے۔ بڑے بڑے نامی بازار
خاص بازار اور اُردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک
قصبہ تھا۔ اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے۔ صاحبان امکنہ و دکاکین نہیں
بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دوکان کہاں تھی۔ برسات بھر
مینہ نہیں برسا۔ آب تیشہ اور کلند کی طغیانی سے مکانات گر گئے۔ غلہ

گراں ہے موت ارزاں ہے۔ میوہ کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال ۸ سیر۔ باجرا ۱۲ اسیر۔ گیہوں ۱۳ اسیر۔ چنے ۱۶ اسیر۔ گھی ڈیڑھ سیر۔ ترکاری مہنگی۔ ان سب باتوں سے بڑھکر یہ بات ہے کہ کنوار کا مہینا جسے جاڑے کا دوار کہتے ہیں، پانی گرم، دھوپ تیز اور لو چلتی ہے۔ جیٹھ اساڑھ کی سی گرمی پڑتی ہے۔ حضرت رفعت درجت جناب صاحب عالم کی خدمت میں دوستانہ سلام اور مریدانہ بندگی بانکسار تمام عرض کرتا ہوں۔ حضرت کو کس راہ سے میرے آنے کا انتظار ہے۔ میں نے مرشد زادہ کے خط میں کب اپنا عزم لکھا۔ یا کسی نے آپ سے میری زبانی کہا۔ کہ آپ روز روانگی کے تقرر سے اطلاع چاہتے ہیں۔ ہاں آپ کی قدمبوسی کی تمنا اور نور اللہ کے دیدار کی آرزو حد سے زیادہ ہے اور ایسا جانتا ہوں کہ یہ آرزو گور تیں لے جاؤں گا۔ تنخواہ کے اجراء کا حال اور مستقبل میں اُس کے وصول کی صورت۔ اُن سطروں سے جو آغاز مکتوب میں چودھری عبدالغفور صاحب کی خدمتمیں لکھی گئی ہے مع روداد شہر معلوم کر لیجئے گا۔ لالہ گوبند پرشاد صاحب ہنوز میرے پاس نہیں آئے ہیں۔ دُنیا دار نہیں۔ فقیر خاکسار ہوں۔ تواضع میری خُو ہے۔ انجاح مقاصد خلق میں حتی الوسع کمی کروں تو ایمان نصیب نہ ہو۔ انشاء اللہ العزیز وہ فقیر سے راضی و خوشنود رہیں گے۔ جناب مستطاب محمد امیر صاحب کی خدمتمیں بعد سلام و نیاز گذارش ہے کہ میرے پاس حضرت کا

سلام پیام سوائے ایکبار کے کبھی نہیں پہونچا۔ اب ان سطور کو اپنا ذریعہ افتخار سمجھا اور نوید مقدم مبارک سے بہت خوش ہوا۔ یہ جو خانہ کوچی و گریز پائی اور بے اطمینانی کا آپ کو مجھ پر گمان ہے اور اس کا رنج ہے۔ یہ خلاف واقع کسی نے آپ سے کہا ہے میں مع زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزم خون کا شنا ور رہا ہوں دروازہ سے باہر قدم نہیں رکھا نہ پکڑا گیا نہ قید ہوا نہ مارا گیا۔ کیا عرض کروں کہ میرے خدا نے مجھ پر کیسی عنایت کی اور کیا نفس مطمینہ بخشا۔ جان و مال و آبرو میں کسی طرح کا فرق نہیں آیا۔ تنخواہ جس کو حضرت نے یومیہ لقب دیا ہے اس کا حال اوروں کی تحریر سے دریافت ہوگا۔ فقیر کو اپنا دوست اور معتقد اور مشتاق تصور فرماتے رہئے گا۔ مرشد زادہ مرتضوی دودمان سید شاہ عالم کو سلام و دُعا۔ ڈپٹی صاحب سے مجھ سے ملاقات کثرت سے نہیں ہے ان کو کثرت اشغال سے فرصت نہیں مجھ کو افراط ضعف سے طاقت نہیں ہاں اگر کبھی اتفاق کہیں ملاقات ہوگئی تو آپ کا سلام کہدوں گا۔ آپ اپنے اخوان عالیشان کو میرا سلام پہونچا دیجئے گا ؎

بندۂ شاہ شمائیم و ثنا خوان شما

ایضاً

بندہ پرور پرسوں تمہارا خط آیا آج لکھ رکھتا ہوں کل ڈاک میں

بھجوادوں گا ...... میرا قیاس اس کا مقتضی ہے کہ پیر و مرشد صاحب عالم مجھ سے آزردہ ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ میں نے ممتاز و اختر کی شاعری کو ناقص کہا تھا۔ اس رقعہ میں ایک میزان عرض کرتا ہوں۔ حضرت صاحب ان صاحبوں کے کلام یعنی ہندیوں کے اشعار کو قتیل و واقف سے لیکر بیدل ناصر علی تک اس میزان میں تولیں میزان یہ ہے رودکی و فردوسی سے لیکر خاقانی و ثنائی و انوری و غیرہم تک ایک گروہ۔ ان حضرات کا کلام تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے! پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہوئے۔ سعدی و جامی و ہلالی یہ اشخاص متعدد نہیں۔ فغانی ایک اور شیوہ خاص کا مبدع ہوا۔ خیالہائے نازک و معانی بلند اس شیوہ کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی سے سبحان اللہ قالب سخن میں جان پڑ گئی اس روش کو بعد اس کے صاحبان طبع نے سلاست کا چرچا دیا صائب و کلیم و سلیم و قدسی و حکیم شفائی اس زمرہ میں ہیں رودکی و اسدی و فردوسی یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا اور سعدی کے طرز نے بہ سبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا فغانی کا انداز پھیلا اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے تو اب طرزیں تین ٹھہریں خاقانی اس کے اقران۔ ظہوری اسکے امثال۔ صائب اسکے نظائر

خالصاً للہ ممتاز و اختر وغیرہم کا کلام ان تین طرزوں میں سے کس طرز پر ہے بے شبہہ فرماؤ گے کہ یہ طرز اور ہی ہے۔ پس تو ہم نے جانا کہ یہ طرز چوتھی ہے۔ کیا کہنا ہے خوب طرز ہے اچھی طرز ہے مگر فارسی نہیں ہے ہندی ہے دار الضرب شاہی کا سکّہ نہیں ہے ٹکسال باہر ہے۔ داد داد انصاف انصاف۔

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار | زیک جام اندر بزم سخن مست
ولے با بادۂ بعضے حریفاں | خمارِ چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم | ورائے شاعری چیزے دگر ہست

وہ چیز اکثر حصّے میں پارسیوں کے آئی ہے یہاں اُردو زبان میں وہ چیز اہلِ ہند نے پائی ہے۔

میر تقی علیہ الرحمتہ۔ **بیت**

بدنام ہو گے جانے بھی دو امتحان کو | رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

سودا۔ **بیت**

دکھلائیے لے جاکے تجھے مصر کا بازار | خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنس گراں کا

مومن خاں۔ **شعر**

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا | جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناسخ کے یہاں کمتر آتش کے یہاں بیشتر یہ تیر نشتر ہیں مگر مجھے کوئی اُنکا شعر اسوقت یاد نہیں آتا

میر مہدی مجروح کے نام

میر مہدی تم میری عادت بھول گئے۔ ماہ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے؟ مَیں اس مہینے میں رامپور کیونکر رہتا۔ نواب صاحب مانع رہے اور بہت منع کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ مگر بھائی مَیں اس انداز سے چلا کہ چاند رات کے دن یہاں آپہونچا۔ یکشنبہ کو غرۂ ماہ مقدس ہوا اسی دن سے ہر روز صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جاکر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قران سنتا ہوں۔ شب مسجد جامع جاکر نماز تراویح پڑھتا ہوں۔ کبھی جو جی میں آتا ہے تو وقت صوم مہتاب باغ میں جاکر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں۔ واہ واہ کیا اچھی طرح عمر بسر ہوتی ہے۔ اب اصل حقیقت سنو۔ لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں اُنھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیجدینے میں وہم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادث ہو تو بدنامی عُمر بھر رہے۔ اس سبب سے جلد چلا آیا ورنہ گرمی برسات وہاں کاٹتا۔ اب بشرط حیات جریدہ بعد برسات جاؤں گا اور بہت دن تک یہاں نہ آؤں گا۔ قرار داد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے جس کو یہ دسواں مہینا ہے، سو روپیہ مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ اب جو مَیں وہاں گیا تو سو رُوپئے مہینا بنام دعوت اور دیا یعنی

رامپور رہوں تو دو سو ماہینا پاؤں اور دلی رہوں تو سو روپے بھائی سو دو سو میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستا وشاگردانہ دیتے ہیں مجھکو نوکر نہیں سمجھتے ہیں۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی معانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے وہ صورت ملاقات کی ہے لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی۔ بس بہرحال غنیمت ہے رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر چاہئے۔ کمی کا شکوہ کیا۔ انگریزی سرکار سے دس ہزار روپیہ سال ٹھہرے۔ اس میں سے مجکو ملے ساڑھے سات سو روپئے سال۔ عزت میں وہ پایا جو رئیس زادوں کے واسطے ہوتا ہے۔ خاں صاحب بسیار مہربان دوستان القاب۔ خلعت سات پارچہ اور جیغہ و سرپیچ و مالاے مروارید۔ بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے۔ بخشی۔ ناظر۔ حکیم کسی سے توقیر کم نہیں مگر فائدہ وہی قلیل سو میری جان یہاں وہی نقشہ ہے۔ کوٹھری میں بیٹھا ہوں۔ ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آرہی ہے۔ پانی کا جھجھرا دھرا ہوا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں یہ خط لکھ رہا ہوں تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا یہ باتیں کرلیں۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور میر نصیرالدین صاحب کو یہ خط پڑھا دینا اور میری دعا کہہ دینا۔ جمعہ۔ ۱۶۔ اپریل۔

ایضاً

واہ حضرت کیا خط لکھا ہے۔ اس خرافات کے لکھنے کا فائدہ۔
بات اتنی ہی ہے کہ میرا پلنگ مجھکو بلا۔ میرا بچھونا مجھکو ملا۔ میرا حمام مجھکو ملا۔ میرا بیت الخلا مجکو ملا۔ رات کا وہ شور کوئی آئیو کوئی آئیو فرو ہوگیا میری جان بچی۔ میرے آدمیوں کی جان بچی۔ ؎ اکنوں شب من شب است روزم روز است ۔ بھئی تم نے یہ نہ لکھا کہ میرن صاحب کو میرا خط پہونچا یا نہ پہونچا میں گمان کرتا ہوں کہ نہیں پہونچا۔ اگر پہونچتا تو بیشک وہ تمہاری نظر سے گزرتا اور میرن صاحب اُس کی اصل حقیقت تم سے پوچھتے اور اس صورت میں یہ بھی ضرور تھا کہ تم اس واہیات کے بدلے مجکو وہ روداد لکھتے جو میرن صاحب میں اور تم میں پیش آئی۔ پس اگر جیسا کہ گمان ہے خط نہیں پہونچا تو خیر جانے دو۔ اگر خط پہونچا ہے تو میرن صاحب کے خط کے جواب لکھوانے میں تم نے میرا دم ناک میں کر دیا تھا۔ اب اُنسے میرے خط کے جواب کا تقاضا کیوں نہیں کرتے۔ میرے خط کے جواب کے باب میں کیوں نہیں کہتے نہ صاحب یہ کچھ بات نہیں۔ میرے خط کا جواب اُن سے لکھوا کر بھجواؤ یہاں کا وہ حال ہے جو دیکھ گئے ہو۔ پانی گرم۔ ہوا گرم۔ تپیں مستولی۔ اناج مہنگا۔ بیچارہ منشی امیر احمد حسین کا بھتیجا میر امداد علی آشوب کا بیٹا۔ محمد میر۔ شب گذشتہ کو گذر گیا۔ آج صبح کو اُس کو

دفن کرآئے۔ جوان صالح۔ پرہیزگار مومنین کا پیش نماز تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیہِ رَاجِعُونَ مجتہد العصر کا حکم بجالاؤنگا اور نہ رئیس کو بلکہ مدارالمہام ریاست کو لکھوں گا۔ رئیس میرے سوال کا جواب قلم انداز کر جائے گا اور مدارالمہام امر واقعی لکھ بھیجے گا۔ میرن صاحب کو دُعا اور کہنا کہ بھلا صاحب تُم نے ہمارے خط کا جواب نہیں لکھا۔ ہم بھی تمہاری طرز کا اتباع کرینگے۔ حکیم میر اشرف علی کو دُعا کہنا اور کہنا کہ اگر تم میں اُن میں راہ و رسم تعزیت و تہنیت ہو تو میر احمد حسین کو خط لکھو اور یہ بھی ان کو معلوم ہو کہ حفیظ یہاں آیا ہوا ہے۔ قبائل تمہارے یہیں ہیں اگر وہاں کُچھ رسائی ہو تو خیر ورنہ کیوں نہیں چلے آتے ؎

میں بھولا نہیں تجکو اے میری جان کروں کیا کہ یہاں گر رہے ہیں مکاں

برسات کا حال نہ پوچھو خُدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ مَیں جس مکان میں رہتا ہوں۔ عالم بیگ خاں کے کٹرہ کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صُبح کے بیٹھنے کا حجرہ جُھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہوگئیں ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں قلمدان سب توشہ خانہ میں۔ فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا۔ کہیں چلمچی دھری ہوئی۔ خط کہاں بیٹھکر لکھوں۔ پانچ چار دن سے فرصت ہے۔ مالک

مکان کو فکر مرمت ہے۔ آج ایک امن کی صورت نظر آئی کہا کہ آؤ میر مہدی کے خط کا جواب لکھوں۔ الور کی ناخوشی راہ کی محنت کشی۔ تپ کی حرارت گرمی کی شرارت۔ یاس کا عالم۔ کثرت اندوہ وغم۔ حال کی فکر۔ مستقبل کا خیال۔ تباہی کا رنج۔ آوارگی کا ملال جو کچھ کہو وہ کم ہے۔ بالفعل تمام عالم کا ایک سا عالم ہے۔ سنتے ہیں کہ نومبر میں مہاراجہ کو اختیار ملے گا۔ مگر وہ اختیار ایسا ہوگا۔ جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے۔ سب کچھ اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا۔ آدمی کو بدنام کیا ہے۔ بارے رفع مرض کا حال لکھو۔ خدا کرے تپ جاتی رہی ہو۔ تندرستی حاصل ہوگئی ہو میر صاحب کہتے ہیں۔ ؎ تندرستی ہزار نعمت ہے ٭ ہائے پیش مصرعہ مرزا قربان علی بیگ سالک نے کیا خوب بہم پہونچایا ہے مجکو پسند آیا ہے ؎

تنگدستی اگر نہ ہو سالک تندرستی ہزار نعمت ہے

مجتہد العصر میر سرفراز حسین صاحب کو دعا۔ اہاہا میر افضل علی صاحب کہاں ہیں۔ حضرت یہاں تو اس نام کا کوئی نہیں ہے۔ لکھنؤ کے مجتہد العصر کے بھائی کا نام میرن صاحب تھا۔ جے پور کے مجتہد العصر کے بھائی میرن صاحب کیوں نہ کہلائیں۔ ہاں بھائی۔ میرن صاحب بھلا اُن کو ہماری دعا کہنا۔

ایضاً

جان غالب تمہارا خط پہونچا غزل اصلاح کے بعد پہونچتی ہے ؎

ہر اک سے پوچھتا ہوں وہ کہاں ہے۔ مصرع بدل دینے سے یہ شعر کس رتبہ کا ہو گیا۔ اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی۔ میاں یہ اہلِ دہلی کی زبان ہے۔ ارے اب اہل دہلی ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی یا گورے ہیں۔ ان میں سے تُو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے۔ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی۔ باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔ خس کی ٹٹی پُروا ہَوا اب کہاں۔ لُطف وہ تو اُسی مکان میں تھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی اور چھت اور سمت بدلی ہوئی ہے۔ بہر حال میگزرد مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کوئیں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنواں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ گر اُٹھ جائیں تو ہو کا عالم ہو جائے یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچہ کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا اب وہ باغیچہ کے صحن کے برابر ہو گیا یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں باقی سب اٹ گیا۔ کشمیر دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک

میدان ہوگیا۔ پنجابی کٹرہ۔ دھوبی واڑہ۔ رامجی گنج۔ سعادت خاں کا کٹرہ۔ جرنیل کی بیوی کی حویلی رامجی داس گودام والے کے مکانات۔ صاحب رام کا باغ حویلی۔ ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہوگیا تھا۔ اب جو کنوے جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہوگیا۔ تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حُسن اعتقاد ارے بندۂ خدا۔ اُردو بازار نہ رہا اُردو کہاں، دلی کہاں، واللہ اب شہر نہیں ہے۔ کیمپ ہے چھاؤنی ہے نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔ اور آلور کا حال کچھ اور ہے مجھے اور انقلاب سے کیا کام۔ الگزنڈر مدرن کا کوئی خط نہیں آیا نظاہر اُن کی مصاحبت نہیں ورنہ مجکو ضرور خط لکھتا رہتا۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور نصیر الدین کو دُعاء۔

نواب امین الدین احمد خاں صاحب بہادر رئیس لوہارو کے نام

اقبال نشانا بخیر و عافیت و فتح و نصرت لوہارو پہونچنا مبارک ہو۔ مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع اکمل المطابع میں چند احباب میرے مسودات اُردو کے جمع کرنے پر اور اُس کے چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں مُجھ سے مسودات مانگتے ہیں اور اطراف و جوانب سے

بھی فراہم کئے ہیں۔ مَیں مسودہ نہیں رکھتا جو لکھا وہ جہاں بھیجنا ہوا
وہاں بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمہارے پاس بہت ہوں گے
اگر اُن کا ایک پارسل بنا کر بسبیل ڈاک بھیج دو گے یا آج کل میں کوئی
ادھر آنے والا ہو اُس کو دیدو گے تو موجب میری خوشی کا ہو گا اور مَیں
ایسا جانتا ہوں اُس کے چھاپے جانے سے تم بھی خوش ہو گے۔ نجونکو دعا

غالب

ایضاً

یکشنبہ ۱۶- فروری ۱۸۶۲ء ہنگام نیمروز۔ صاحب کل تمہارے خط کا جواب
بھیج چکا ہوں پہونچا ہو گا۔ آج صبح کو بھائی صاحب کے پاس گیا بھائی
ضیاء الدین خاں اور بھائی شہاب الدین خاں بھی وہیں تھے۔ مولوی
صدرالدین میرے سامنے آئے۔ حکیم محمود خاں کے طور پر معالجہ قرار پایا
ہے۔ یعنی اُنھوں نے نسخہ لکھ دیا ہے سو اس کے موافق حبوب بن گئی
ہیں۔ نقوع کی دوائیں آج آکر بھیگیں گی۔ کل حبوب کے اوپر وہ
نقوع پیا جائے گا مگر انداز و ادا سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حضرت
مریض کی اور اُن کے ہوا خواہوں کی رائے ہیں قصد اس استعلاج کا
مذبذب ہے۔ نسخہ کی حقیقت کو میزان نظر میں تول رہے ہیں۔ اُستاد
میر جان بھی تھے نیم نا معقول مرزا اسد بیگ بھی تھے۔ سب طرح

خیریت ہے۔ کل تمہارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلّی بڑا شہر ہے ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان یہ وہ دلّی نہیں ہے جسمیں تم پیدا ہوئے ہو وہ دلّی نہیں ہے جسمیں تم نے علم تحصیل کیا ہے وہ دلّی نہیں ہے جسمیں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے وہ دلّی نہیں ہے جسمیں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں وہ دلّی نہیں ہے جسمیں اکیاون برس سے مقیم ہوں ایک کمپ ہے۔ مسلمان اہل حرفہ یا حکّام کے شاگرد پیشہ۔ باقی سراسر ہنود معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپیہ مہینا پاتے ہیں۔ اُمرائے اسلام میں سے اموات گنو۔ حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپیہ روز کا پنشن دار سو روپیہ مہینا کا روزینہ دار بنکر گیا۔ میرنا صرالدین باپ کی طرف سے پیرزادہ نانا اور نانی کی طرف سے امیر زادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان۔ بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے بیمار پڑا نہ دوا نہ غذا انجام کار مر گیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احبا کو پوچھو ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آ گیا اُس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ ٹکے کی آمد نہیں مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے مگر دیکھئے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے صاحب ساری املاک بیچکر نوش جان کر کے بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کے پاس پانسو روپیہ کرایہ کی واگذاشت

ہو کر پھر قرق ہوگئی تباہ خراب لاہور گیا وہاں پڑا ہوا ہے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڈھ اور بلب گڈھ اور فرخ نگر۔ کم و بیش تیس لاکھ روپئے کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے جو حکما کا حال لکھا ہے وہ بیانِ واقع ہے۔ صلحا اور زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے اُس کو بھی سچ جانو۔ اپنے والد ماجد کی طرف سے خاطر جمع رکھو سحر۔ آسیب کا گمان ہرگز نہ کرو۔ خدا چاہے تو استعمال ایارجات کے بعد بالکل اچھے ہو جائیں گے اور اب بھی خدا کے فضل سے اچھے ہیں۔ عافیت کا طالب غالب۔

منشی تفضل حسین خاں صاحب کے نام

کیوں صاحب یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی و اُستادی سب پر پانی پھر گیا۔ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور مَیں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے۔ میرا کلام خرید آٹھ دس روپیہ کی سو وہ بھی مَیں یہ نہیں کہتا کہ مجھکو دے ڈالو تم کو مبارک رہے مجھ کو مستعار دو۔ مَیں اس کو دیکھ لوں جو میرے پاس نہیں ہے اس کی نقل کر لوں پھر تم کو واپس بھیجدوں۔ اس طرح پر طلب پر نہ دینا دلیل اس کی ہے کہ مجھ کو جھوٹا جانتے ہو۔ میرا اعتبار نہیں یا مجھ کو آزار دینا اور ستانا بہ دلِ

منظور ہے وہ کتاب ابھی میرے آدمی کو دیدو۔ واللہ باللہ اس میں سے جو میرے پاس نہیں ہے نقل کر کے تم کو بھیجدوں گا۔ اگر تم کو واپس نہ دوں تو مجھ پر لعنت اور اگر تم میری قسم کو نہ مانو اور کتاب حامل رقعہ کو نہ دو تو تم کو آفریں۔

یوسف مرزا صاحب کے نام

یوسف مرزا تجھ کو کیوں کر لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا۔ اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودہ آبنائے روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجا کٹ گیا ہے اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیوں نہ تڑپے گا۔ صلاح اس میں نہیں بتائی جاتی۔ دُعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا پھر باپ مرا مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔ تمہاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ یہ بات اگر سچ ہے تو جوان مرد ایکبار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قید حیات رہی نہ قید فرنگ۔

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد

پیدائش دلّی ۱۸۳۱ء　　　وفات لاہور ۱۹۱۰ء

مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر شرفاء دلّی میں ایک نامور شخص تھے۔ اُردو اخبار نامی اردو زبان کا پہلا اخبار ۱۸۵۵ء میں مولوی محمد باقر ہی نے دلّی میں نکالا تھا۔ آزاد نے عربی فارسی کی تعلیم ابتدا سے پُرانے دلّی کالج کے اورینٹل ڈیپارٹمنٹ میں پائی اردو نظم و نثر لکھنے کی استعداد انکو کالج ہی میں حاصل ہوگئی تھی اور نظم میں ذوقؔ کے شاگرد رشید تھے جب غدر کے بعد مولوی محمد باقر مارے گئے تو آزاد کو وطن چھوڑ کر دکن بھاگنا پڑا ایک عرصہ کی آوارہ گردی کے بعد ان کو لاہور آنا نصیب ہوا اور وہاں سررشتہ تعلیم کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب کی سفارش اور سررشتہ تعلیم کے ڈائرکٹر میجر فلر صاحب کی قدردانی آزاد کی ترقی کا باعث ہوئی ۔ پنجاب میں گورنمنٹ کی طرف سے ایک اخبار سرکاری اخبار کے نام سے نکلتا تھا۔ آزاد کچھ دن اس کے اسسٹنٹ

اڈیٹر رہے پھر پنجاب گورنمنٹ کے میر منشی پنڈت من پھول کے ساتھ سنہ ۱۸۶۵-۶۶ء میں کابُل اور بدخشاں گئے اور وہاں سے لوٹ کر لاہور کے سرکاری کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے سنہ ۱۸۸۵ء میں ان کو ایران کا سفر کرنا پڑا جس کا تذکرہ اشارتاً کہیں کہیں سخندان پارس میں پایا جاتا ہے۔ سنہ ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی پہلی جوبلی پر آپ کو سرکار انگریزی کی طرف سے شمس العلما کا خطاب عطا ہوا۔

شاہراہ قدیم سے ہٹ کر اُردو شاعری کے لئے جدید روش پیدا کرنے کا سہرہ مولوی محمد حسین آزاد کے سر ہے۔ مولانا حالی مجموعہ نظم حالی کے دیباچہ میں فرماتے ہیں۔

"سنہ ۱۸۷۴ء میں جب راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق اور لاہور میں مقیم تھا مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سرشتہ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینے ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا اس مشاعرہ کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ دردِ عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہو گئی تھی اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دیجائے"۔

چنانچہ اس طرز کی کئی نظمیں۔ شبِ قدر۔ موسم زمستاں۔ صبح امید حُبِ وطن وغیرہ آزاد کی نظم کے مجموعوں میں چھپ چکی ہیں۔

نثر میں آزاد کی کتابیں دو قسم کی ہیں اوّل وہ جو اُنھوں نے پنجاب کے سررشتہ تعلیم کے واسطے لکھیں اور جن میں اردو کا قاعدہ پہلی دوسری اور چوتھی کتابیں۔ قصص ہند حصّہ دوم۔ فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب اور جامع القواعد شامل ہیں دوسری وہ کتابیں جو اُنھوں نے اپنے شوق سے لکھیں اور جن میں آب حیات نیرنگ خیال دربار اکبری سخندان پارس بہایت مشہور اور مقبول ہیں۔ آزاد کی طرز تحریر ثنا و صفت سے مستغنی ہے۔ بیان کی لطافت زبان کی سلاست بندش کی چستی اور محاورے کی دلآویزی جس قدر اور جس اُسلوب سے آزاد کے یہاں ہے اُردو کے دوسرے نثار کے یہاں نہیں پائی جاتی اور ظرافت کی چاشنی ان سب پر طرّہ ہے۔ ایک خاص وصف اس مُصنّف کا یہ ہے کہ بقول منشی بالمکند صاحب گپت "وہ جس قلم سے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی کتاب لکھ سکتا ہے اُسی سے ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کی بھی لکھ سکتا ہے .... اس کا وہی قلم آب حیات اور نیرنگ خیال لکھ کر اُردو کے فضلا کو حیرت میں ڈال سکتا ہے اور وہی قلم اُردو کی پہلی اور میٹھی لوری لکھ کر چھوٹے چھوٹے بچّوں کو ہنسا اور چپ کر سکتا ہے۔ وہ سمجھ دار اور بوڑھوں کو باغ اُمید دکھا کر لُبھا سکتا ہے اور ننھے ننھے بچّوں کو

مالی کے پودے لگاتے اور کیاریوں میں پانی بہنے کی بات سُناکر بہلاسکتا ہے...... اس کی ہر شے میں اس کا آزاد پن موجود ہے،، اور یہ وصف ایسا ہے کہ جو شاید دُنیا کے بہت کم مصنفوں کے حصہ میں آیا ہے۔

آزاد کی ایک اور صفت بھی قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ ایجاد اور اختراع کے ہر موقع پر اس کا ذوق سلیم یہ بتا دیتا ہے کہ کون سی اختراع قابل پذیرائی ہے اور کون سا ایجاد زبان کے مزاج اور خواص کے خلاف ہے۔ یہ ایسا نکتہ ہے کہ جس کو نئی روشنی کے دلدادہ مغربی ادب کی تقلید کی دُھن میں اکثر نظر انداز کر جاتے ہیں اور جس کے نظر انداز کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ثقیل الفاظ مہمل ترکیبوں اور بھدے۔ بے جوڑ محاوروں کی آمیزش سے زبان اپنی اصلی لطافت کو بھی کھو بیٹھی ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ اُردو کی ترقی کا اس سے بہتر وسیلہ نہیں ہو سکتا کہ مولوی محمد حسین آزاد کے اصولِ فن اور طرزِ تحریر کی پیروی کی جاے۔

زبان اُردو کی تاریخ

ماخُوذ از آبِ حیات

اِتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دُنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ ہی آئی ہو۔ اس کی عُمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے۔ تم خیال کرو گے کہ شاید اس میراث قدیمی کی سند سنسکرت کے پاس ہوگی اور وہ ایسا بیج ہوگا کہ چھوٹا ہوگا اور یہیں پھلا پھولا ہوگا۔ لیکن نہیں۔ ابھی سُراغ آگے چلتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہندوستان اگرچہ بے ہمتی اور آرام طلبی کے سبب سے بدنام رہا مگر باوجود اسکے مہذب قوموں کی نگاہ میں ہمیشہ سے کھپا رہا ہے۔ چنانچہ اس کی سرسبزی اور زرخیزی اور اعتدال ہوا نے بلائے جان ہو کر ہمیشہ اُسے غیر قوموں کی گھڑ دوڑ کا میدان بنائے رکھا ہے۔ پس دانائے فرنگ کہ ہر بات کا پتہ پتال تک نکالنے والے ہیں اُنھوں نے زبانوں اور قدیم نشانوں سے ثابت کیا ہے کہ یہاں کے اصلی باشندے اور لوگ تھے۔ ایک زبردست قوم نے آکر آہستہ آہستہ کُل مُلک پر قبضہ

کرلیا۔ یہ فتحیاب غالباً جیہوں سیہوں کے میدانوں سے اُٹھ کر اور
ہمارے شمالی پہاڑ اُلٹ کر اس مُلک میں آئے ہوں گے اِس زمانہ
کے گیت اور پُرانی نشانیاں دیکھ کر یہ بھی معلوم کیا ہے کہ وہ لوگ
دل کے بہادر۔ ہمت کے پورے۔ صورت کے وجیہ رنگ کے
گورے ہوں گے اور اُس زمانہ کی حیثیت بموجب تعلیم یافتہ بھی
ہوں گے۔ موقع کا مقام اور سرسبز زمین دیکھ کر یہیں زمین گیر ہوئے
اس قوم کا نام ایرین تھا اور عجب نہیں کہ ان کی زبان وہ ہو جو اپنے
اصل سے کچھ کچھ بدل کر اب سنسکرت کہلاتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جنھوں
نے ہندوستان میں آکر راجہ مہاراجہ کا خطاب لیا ایران میں تاج
کیانی پر دُرفش کاویانی لہرایا۔ اپنے مذہب کا نادر طریقہ لیکر چین کو
نگار خانہ بنایا یونان کا طبقہ حکمت سے الگ جمایا۔ روما کی عالمگیر
سلطنت کی بنیاد ڈالی اندلس پہونچ کر چاندی نکالی یورپ سے
خبر آئی کہ کہیں دریا سے مچھلیاں نکالتے نکالتے گوہر سلطنت پائے۔
کہیں پہاڑوں سے دھات کھودتے کھودتے لعل بے بہا نکال
لائے تب اصلی رہنے والے کون تھے، اور اُن کی زبان کیا تھی؟
قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پنجاب میں اب قطعہ قطعہ کی
کی زبان کہیں کچھ کچھ اور کہیں اختلاف رکھتی ہے اور یہی حال اور

اور اضلاع ہند میں ہے۔ اسی طرح اِس عہد میں بھی اختلاف ہوگا اور اس عہد کی نامی زبانیں وہ ہوں گی جن کی نشانی تامل۔اوڑیا اور تلیگو وغیرہ اضلاع دکن اور مشرق میں اب تک یادگار موجود ہیں بلکہ اس حالت میں بھی اُن کی شاعری اور انشاپردازی کہتی ہے کہ یہ گٹھلی کسی لذیذ میوے کی ہے اور سنسکرت سے انھیں لگاؤ تک نہیں۔

فتحیابوں نے ہندوکش کے پہاڑ اُتر کر پہلے تو پنجاب ہی میں ڈیرے ڈالے ہوں گے پھر جوں جوں بڑھتے گئے ہوں گے اصلی باشندے کُچھ تو لڑتے مرتے دائیں بائیں جنگلوں کی گود اور پہاڑوں کے دامن میں گُھستے گئے ہوں گے اور وہی شودر کہلائے ہوں گے چنانچہ اب تک بھی اُن کی صورتیں کہے دیتی ہیں کہ یہ کسی اور بدن کی ہڈی ہیں۔

مُدت دراز تک ایرین بھائیوں کے کاروبار ہندوستانی بھائیوں کے ساتھ مِلے جُلے رہے ہوں گے یہی سبب ہے کہ ایران کی تاریخ قدیم میں مہ آباد اور اُس کے زمانہ کی تقسیم برہما کے زمانہ سے اور اُسکے رسوم و قواعد سے مطابقت دکھاتی ہے اور چاروں برنوں کا برابر پتہ لگتا ہے یہاں بودھ نے انھیں توڑا وہاں زرتشت کے مذہب نے اُسے جلاکر خاک کیا مگر ہندوؤں نے بودھ کے بعد پھر اپنی حالت

کو سنبھال لیا ایرانی اپنی حالت کو نہ سنبھال سکے۔
چاروں برنوں کی تقسیم اور اُن کا الگ تھلگ رہنا دور سے
دیکھنے والوں کو غرور کے لباس میں نظر آیا مگر حق پوچھو تو یہ کچھ بُری
بات نہ تھی۔ اسی کی برکت ہے کہ آج تک چاروں سلسلے صاف الگ
الگ چلے آتے ہیں۔ جو ہندو ہو گا ماں باپ دونوں کی طرف سے
خالص ہو گا اور برابر اپنے قوم کا پتہ بتا سکے گا۔ جو دوغلہ ہو گا اُس کا
سلسلہ الگ ہو جائے گا۔ اگر یہ قیدیں اس سختی کے ساتھ نہ ہوتیں تو
تمام نسلیں خلط ملط ہو جاتیں۔ نجیب الطرفین آدمی چاہتے تو ڈھونڈھے
نہ ملتا۔ فتحیابوں کی ان سخت قیدوں نے آپس کی بندشوں میں عجیب
طرح کے پھندے ڈالے، چنانچہ جب نسلوں کی حفاظت کا پورا بندوبست
کر چکے تو خیال ہوا کہ شودروں کے ساتھ آٹھ پہر بات چیت رہنے سہنے
اور لین دین کرنے میں بزرگوں کی زبان دوغلی ہو جائے گی اسواسطے
کہا کہ ہماری زبان زبان الٰہی ہے اور الٰہی عہد سے اسی طرح چلی
آئی ہے، چنانچہ اس کے قواعد اور اصول باندھے اور ایسے جانچ کر
باندھے جن میں نقطہ کا فرق نہیں آسکتا اس کی پاکیزگی نے غیر لفظ
کو اپنے دامن پر ناپاک دھبا سمجھا اور سوا برہمن کے دوسرے کی
زبان بلکہ کان تک گذرنا بھی ناجائز ہوا۔ اس سخت قانون نے

بڑا فائدہ یہ دیا کہ زبان ہمیشہ اپنی اصلیت اور بزرگوں کی یادگار کا خالص نمونہ نمایاں کرتی رہے گی برخلاف **ایرانی** بھائیوں کے ان کے پاس زبانی سند بھی نہ رہی۔

اِسی بُنیاد پر فتحیابوں کی بلند نظری نے اس کا نام **سنسکرت** رکھّا جس کے معنی آراستہ وپیراستہ۔ صنعتی۔ منزّہ۔ مصفّا۔ مقدّس جو چاہو سمجھ لو۔ ان کے قواعد زبان بھی ایسے مقدّس ہوئے کہ بزرگان دین ہی اُسے پڑھائیں تو پڑھائیں بلکہ اس طرح پُکار کر پڑھنا بھی گناہ ہوا کہ شودر کے کان میں آواز پڑے۔ اِس زبان کا نام **دیوبانی** ہوا یعنی زبان الٰہی۔ زبان دان **وید** کے سنہ ترتیب جس سے عہد کی زبان کا پتہ لگے ۱۴ سو برس قبل سنہ عیسوی خیال کرتے ہیں۔ اس وقت ان فتحیابوں کی باتیں اس مُلک اور مُلک والوں کے ساتھ ایسی سمجھ لو جیسے ہندوستان میں پہلے پہلے مسلمانوں کی حالتیں۔ اِن کے سنسکرت زبان کے مخرج اور تلفظ یہاں کے لوگوں میں آکر کُچھ اور ہو گئے ہوں گے۔ اس لئے گھروں اور بازاروں میں باتیں کرنے کو قطعہ قطعہ میں پراکرت زبانیں خود بخود پیدا ہو گئی ہوں گی۔ جیسے اسلام کے بعد اُردو چنانچہ ماگدی (پالی) سوسینی۔ مہاراشٹری وغیرہ قدیمی پراکرتیں اب بھی اپنی اپنی قدامت کا پتہ

بتلاتی ہیں۔ ان کی سیاہی میں سیکڑوں لفظ سنسکرت کے چمکتے
نظر آتے ہیں مگر بگڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دیکھا! پرکت کے
معنی ہیں طبیعت اور جو طبیعت سے نکلے چنانچہ ہیم چند لغات
سنسکرت کا جامع بھی یہی کہتا ہے اس کے علاوہ سنسکرت
مہذب اور مقدس اور پراکت غیر مذہب لوگوں کو کہتے ہیں۔ پس
ایسی ایسی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فہمیدہ لوگ تھے ہر بات
کو خوب سمجھتے تھے اور جو کچھ انھوں نے کیا سمجھکر کیا ہے۔

راجہ بھوج کے عہد کی ناٹک پُستکیں کہتی ہیں کہ ان عہدوں
میں علمی کتابیں اور درباری زبان تو سنسکرت تھی۔ مگر چونکہ
معاملہ خاص و عام سے پڑتا ہے اس لئے گفتگو میں پنڈتوں کو
بھی پراکت ہی بولنی پڑتی تھی۔ پراکرت صاف سنسکرت کی بیٹی
معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں ہزاروں لفظ سنسکرت کے ہیں
اور ویسے ہی قاعدے صرف نحو کے بھی ہیں سنسکرت کی اتنی حفاظت
ہوئی پھر بھی منوسمرتی ویدوں کی ترتیب سے کئی سو برس بعد لکھی
گئی تھی۔ اس میں اور وید کی زبان میں صاف فرق ہے اور
اب اور بھی زیادہ ہو گیا لیکن چونکہ سلطنت اور معتبر تصانیف پر
مذہب کا چوکیدار بیٹھا تھا اس لئے نقصان کا بہت خطرہ نہ تھا

کہ دفعتہً ۵۴۴ برس قبل عیسوی میں بدھ مذہب کے بانی شاک منی پیدا ہوئے وہ مگدھ دیس سے اُٹھے تھے اس لئے وہیں کے پراکرت میں وعظ شروع کیا۔ کیونکہ زیادہ تر کام عوام سے تھا۔ عورت مرد سے لیکر بچے اور بوڑھے تک یہی اس دیس کی زبان تھی۔ انکی آتش زبانی سے مذہب مذکور ایسا پھیلنا شروع ہوا جیسے بن میں آگ لگے۔ دیکھتے دیکھتے دھرم حکومت۔ رسم و رواج دین آئین سب کو جلا کر خاک کردیا اور مگدھ دیس کی پراکرت کُل دربار اور کُل دفتروں کی زبان ہوگئی۔ اقبال کی یاوری نے علوم و فنون میں بھی ایسی ترقی دی کہ تھوڑے ہی دنوں میں عجیب و غریب کتابیں تصنیف ہوکر اسی زبان میں علوم کے کتبخانے سج گئے اور فنون کے کارخانے جاری ہوگئے کہیں کہیں کونہ گوشہ میں بھاں کے راجہ وید کو مانتے رہے وہاں ویدوں کا اثر رہا۔ باقی راج کے دربار اور علمی سرکار سب ماگدھی ہی ماگدھی ہوگئی۔ ان کے حوصلے وسیع ہوکر دعوے بڑھے اور بآواز بلند کہدیا کہ ابتدائے عالم سے تمام زبانوں کی اصل ماگدھی ہے۔ برہمن اور کُل انسان بات کرنیکے لائق بھی نہ تھے اصل میں ان کی بھی اور قادر مطلق بودھ کی زبان بھی یہی ہے۔ اس کے صرف نحو کی کتابیں بھی تصنیف ہوئیں۔ خدا کی قدرت دیکھو جو لونڈی تھی وہ رانی بن بیٹھی اور رانی مُنہ چھپا کر کونے میں بیٹھ گئی۔

زمانہ نے اپنی عادت کے بموجب (تخمیناً ۵ اسو برس بعد) بودھ مذہب کو بھی رخصت کیا اور ان کے ساتھ اُن کی زبان بھی رخصت ہوئی۔ شنکراچارج کی برکت سے برہمنوں کا ستارہ ڈوبا ہوا پھر ابھر کر چمکا اور سنسکرت کی آب و تاب بھی شروع ہوئی۔ راجہ بکرماجیت کے عہد میں جو روشنی اسکی فصاحت نے پائی آجتک لوگوں کی آنکھوں کا اُجالا ہے۔ اُس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ دربار سلطنت اور اعلیٰ درجہ کے لوگوں کو سنسکرت بولنا اعتبار و افتخار کی سند تھا اور پراکرت عوام کی زبان تھی۔ کیونکہ اس عہد میں جو کالی داس ملک الشعراء نے شکنتلا ناٹک لکھا ہے۔ سبھا میں دیکھو بادشاہ۔ اُمرا اور پنڈت سنسکرت بول رہے ہیں کوئی عام آدمی کچھ کہتا ہے تو پراکرت میں کہتاہے گیارھویں صدی عیسوی سے پہلے راجہ بھرت کے عہد میں برج کے قطعہ کی وہ زبان تھی جسے ہم آج کی برج بھاشا کی اصل کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت میں بھی ہر قطعہ میں اپنی اپنی بولی عام لوگوں کی حاجت روائی کرتی تھی اور سنسکرت تصنیفات اور خواص کی زبانوں کے لئے باعث برکت تھی کہ دفعتہً زمانہ کی شعبدہ بازی نے ایک اور رنگ بدلا۔ یعنی اسلام کا قدم ہندوستان میں آیا۔ اس نے پھر ملک و مذہب کو نیا انقلاب دیا اور اسی وقت سے زبان کا اثر زبان پر دوڑنا شروع ہوا۔

سنسکرت اور اصل فارسی یعنی ژند واستا کی زبان ایرین کے رشتہ سے ایک دادا کی اولاد ہیں مگر زمانے کے اتفاق کو دیکھو کہ خدا جانے کے سو برس یا کے ہزار برس کی بچھڑی ہوئی بہنیں اس حالت سے آکر ملی ہیں کہ ایک دوسرے کی شکل نہیں پہچان سکتی۔

ہندوستانی بہن کی کہانی تو سُن چکے اب ایرانی بہن کی بھی داستان سُن لو کہ اُس پر وہاں کیا گذری اوّل تو یہی قیاس کرو کہ اس مُلک نے جو ایران نام پایا شاید وہ لفظ ایرین ہی کی برکت ہو۔ پھر یہ بھی کچھ تھوڑے تعجب کا مقام نہیں کہ جس طرح ہندوستانی بہن پر وقت بوقت بودھ وغیرہ کے حادثے گذرے اسی طرح اس پر بھی وہاں انقلاب پڑتے رہے باوجود اس کے اب تک ہزاروں لفظ فارسی اور سنسکرت کے صاف مِلتے جُلتے نظر آتے ہیں۔

ایرانی بہن جب اس مُلک میں جا کر بسی ہوگی تو مدت تک اُن کے مذہب۔ رسم و رواج اور زبان جیسے تھے ویسے ہی رہے ہوں گے مگر اس زمانہ کی کوئی تصنیف ہاتھ نہیں آئی کُچھ ٹوٹا پھوٹا پتا ملتا ہے تو زرتشت کے وقت سے مِلتا ہے جسے آج تخمیناً ۲۴۰۰ برس ہوئے اِس نورانی موحد نے شعلۂ آتش کے پردہ میں توحید کے مسئلہ کو رواج دیا۔ مذہب مذکور نے سلطنت کے بازؤں سے

زور پکڑا اور ایران سے نکل کر دو سو برس کے قریب اطراف و جوانب کو دباتا رہا۔ یہاں تک کہ یونان سے سکندر طوفان کی طرح اُٹھا اور ایشیا کے امن و امان کو تہ و بالا کر دیا۔ جو مصیبت بودھ کے ہاتھ سے بید شاستر پر بڑی تھی وہاں وہی مصیبت ژند واستا پر آئی چنانچہ جس آگ نے زرتشت اور جاماسپ کے متبرک ہاتھوں سے آتش خانوں کو روشن کیا تھا جس کے آگے گشتاشب نے تاج اُتار کر رکھا جس کی درگاہ میں اسفندیار نے گرز اور تلوار چڑھائی وہ یونان کے آب شمشیر سے بجھائی گئی اور آتش خانے راکھ ہو کر اُڑ گئے۔ افسوس یہ ہے کہ ژند و پاژند کے ورق ورق برباد کئے گئے اور ہزاروں کتابیں فلسفہ الٰہی اور علوم و فنون کی تھیں کہ نابود ہو گئیں جبکہ یونانیوں نے ملک پر غلبہ پایا تو زبان نے بھی زبانوں پر زور دکھایا ہو گا تھوڑے ہی دنوں میں پارتھیا والوں کا عمل دخل ہو گیا وہ ایران جسے ہزاروں برس سے ملک گیری کے نشان سلامی اُتارتے تھے اور تہذیب و شائستگی اس کے دربار میں سر جھکاتے تھے ۵۰۰ سو برس تک ظفریابوں کے قبضہ میں دبا رہا اور ژند کی کتب مقدسہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کی گئیں۔

سنہ ۲۲۶ء میں پھر تن بے جان میں سانس آیا اور ساسانیوں کی تلوار و نیز قدیمی اقبال نے چمک دکھائی۔ ان بادشاہوں نے ملک و مملکت کی قدامت کے ساتھ بجھے ہوئے مذہب کو بھی روشن کیا۔ گرے ہوئے آتش خانوں

کو پھر اُٹھایا اور جہاں جہاں سے پُرانے اور پریشان اوراق ہاتھ آئے بہم پہونچائے۔ انھیں کی کوششوں کی کمائی تھی جو پھر ساڑھے چار سو برس بعد عَلَم اسلام کے آگے قربانی ہوئی۔ اس معاملہ میں ہمیں نیک نیت پارسیوں کا شکریہ نہ بھولنا چاہئے کیونکہ باوجود تباہی اور خانہ بربادی کے جو پُرانا کاغذ کسی بااعتقاد کے ہاتھ آیا وہ جان کے ساتھ ایمان کو بھی لیتا آیا کہ بندر سورت۔ گجرات وغیرہ ملکوں میں آج تک اسی نور سے آتشخانے روشن ہیں جو کچھ اُن کے پاس ہے وہ اُن تصنیفات کا بقیہ ہے جو ساسانیوں کے عہد میں ہوئیں۔ کتب مذکورہ دونوں زبانوں کا لفظی اتفاق ہی نہیں ثابت کرتیں بلکہ ان کے اتحاد و اعتقاد پر بھی شہادت دیتی ہیں۔ جو چار برن ہندوؤں میں ہیں وہی ایران میں تھے اجرام آسمانی کی عظمت واجب تھی۔ حیوانات بے آزار کا مارنا گناہ عظیم تھا۔ تناسخ کا مسئلہ دونوں میں یکساں تھا۔ آتش۔ آب۔ خاک۔ باد۔ ابر۔ بجلی۔ گرد۔ ہوا وغیرہ اشیاء کے لئے ایک ایک دیوتا مانا ہوا تھا جس کے اظہار عظمت کے لئے خاص خاص طریقے تھے یاد الٰہی کے زمزمے تھے جس کو وہ اپنی اصطلاح میں گاتا تھا۔ کہتے تھے یہ وہی لفظ ہے جس کے معنی پر یہاں گیتا کتاب ہے کیونکہ اس میں یاد الٰہی کے گیت ہیں فارسی مروّجہ کے چند الفاظ تمثیلاً لکھتا ہوں

کہ سنسکرت سے ملتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
پدر	پتر	برادر	بھراتر	پور	پُتر
دختر	دوہتر	مادر	ماتر	انگشت	انگشٹ
زانو	جانو	پا	پاؤ	بار	بھار
بیم	بھے	بوم	بھُوم	خاشاک	کشّیا
اسپ	اشو	خر	کھر	×	×

ایرانی بہن پر ایران میں پہلے اسلام کے ہاتھ سے وہ صدمہ گذرا تھا جو کہ یہاں دو سو برس بعد گذرا اور اُس سے اس کی حیثیت بالکل بدل گئی تھی۔ بہرحال یہاں وہ ایسی حالت کے ساتھ پہونچی کہ عربی اور تُرکی الفاظ اور بہت سی لفظی اور ترکیبی تبدیلیوں کے سبب سے اسکی صورت نہ پہچانی جاتی تھی۔ یہاں جو مسلمان آئے وہ آپس میں وہی رائج الوقت فارسی بولتے تھے اور ہندؤں سے ہندی الفاظ ملا جُلا کر گزارہ کر لیتے تھے۔

ادھر سنسکرت تو دیوبانی یعنی زبان آسمانی تھی۔ اس میں ملکشوں

کو دخل کہاں۔ البتہ برج بھاشا نے اس بن بُلائے مہمان کو جگہ دی دھرم وان ہندو سالہا سال تک ملکش بھاشا سمجھکر غیر زبان سے متنفر رہے مگر زبان کا قانون دھرم اور حکومت کے قانون سے بھی سخت ہے کیونکہ اسے گھڑی گھڑی اور پل پل کی ضرورتیں مدد دیتی ہیں جو کسی طرح بند نہیں ہوتیں۔ غرض آٹھ پہر ایک جگہہ کا رہنا رہنا سہنا لین دین کرنا تھا۔ لفظوں کے بولے بغیر گزارہ نہ کر سکے۔ دو قوموں کے ارتباط میں ایسا اختلاط ضرور ہوتا ہے اور اس کے کئی سبب ہیں اوّل تو یہ کہ اکثر نئی چیزیں ایسی آتی ہیں جو اپنے نام اپنے ساتھ لاتی ہیں (۲) اکثر معانی ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں اُن ہی کی زبان میں کہیں تو ایک لفظ میں ادا ہو جاتے ہیں۔ ترجمہ کریں تو ایک فقرہ بنتا ہے پھر بھی نہ وہ مزہ آتا ہے نہ مطلب کا حق ادا ہوتا ہے۔ اس صورت میں گویا قانونِ زبان اور آئین بیان مجبور کرتا ہے کہ یہاں وہی لفظ بولنا چاہئے دوسرا لفظ بولنا جائز نہیں۔ (۳) جو لوگ اکثر غیر ملکوں میں سفر کرتے ہیں وہ اس لطف کو جانتے ہیں جبکہ دو غیر زبان والے ایک جگہہ رہتے ہیں تو کبھی کام کاج کی شدت مصروفیت میں کبھی اُسی عالم میں ضروری بات جلدی کہہ دینے کی غرض سے کبھی آسانی سے مطلب سمجھانے کو ایک دوسرے کے لفظ خواہ مخواہ اس طرح بول جانے پڑتے ہیں کہ بے اُس کے گزارہ

نہیں ہوتا۔(۴) پھر جب ایک جگہ رہ کر شیر و شکر ہوتے ہیں تو اکثر پیار اور محبت سے کبھی آپس کی دلگی کے لئے ایک دوسرے کے لفظ بول کر جی خوش ہوتا ہے جس طرح دوست کو دوست پیارا ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کے لفظ بھی پیارے معلوم ہوتے ہیں یا یوں سمجھو کہ جس طرح وطن دار اپنے مہمانوں کے رہنے کو جگہ دیتے ہیں اسی طرح ان کی زبان مہمان لفظوں کو جگہ دیتی ہے (۵) بڑی بات یہ ہے کہ فتحیابوں کے اقبال کی چمک اُن کی بات بات کو بلکہ لباس۔ دستار۔ رفتار۔ گفتار کو بھی اُسی آب و تاب سے جلوہ دیتی ہے کہ وہی سب کی آنکھوں میں بھلے معلوم ہوتے ہیں اور لوگ اُسے فقط اختیار ہی نہیں کرتے بلکہ اُس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ پھر اُس میں بہت سے فوائد بھی عقلی دلائل سے پیدا کرتے ہیں۔

اُس زمانہ کی عہد بعہد کی ہندی تصنیفیں آج نہیں ملتیں جن سے وقت بوقت اس کی تبدیلیوں کا حال معلوم ہوا البتہ جب ۱۱۹۳ء میں شہاب الدین غوری نے راے پتھورا پر فتح پائی تو چند کوی (ایک نامی شاعر) نے پرتھی راج راسا لکھا۔ اُسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ زبان مذکور نے کتنا جلد عربی فارسی کے اثر کو قبول کر لیا۔ ہر صفحہ میں کئی کئی لفظ نظر آتے ہیں ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسوقت میں یہاں کی بھی کچھ اور بھاشا تھی ہیں نمونہ تصنیف

مذکور کا دکھاتا ہوں۔

७७ पत्र उठि महल प्रिथीराज मंगिआरी हनि वा जीय।
॥ ६ परबरदिगार पैगाम रहय लाह करीम कैवार सुरतान जलालदीन जाया सुरतान सहावदीन अलह उपाया मुसलमान मद निदानभीमदति' इतनी कहैरकहन लागौ पाति शह सैतान परवरे देवारौं दीवान छुड्या जादवनि बैरं मड्या पलक आलम अलीई जीवतै बहुआनपोई हजरति-षुदाय वेल आस मरदां मं लसि धवासहाव साईदेयचादर उचाई
इतने मुलक को फरमान पेस कजलविलासकैलास राहपं धारगपर
५२ पत्रपाय घालि प्रिथीराज वांहदीनि सुलतानिकरि सलामति हिवार परीअंगुलि सुलितनं।

۷۷۔ پتر اُٹھ محل پرتھی راج منگیاری ہن واجی۔
۶۔ پتر پرور دگار پیگام رہے لاہ کریم کے بار سرطان جلال الدین جایا سرطان شہاب الدین اللہ اوپایا مسلمان مد ندان بھیم دت اتنی کہے رک ہن لاگو پاتی شاہ شیتاں پرورے دیواروں دیوان چھڑیو جادین بیر منڈیا پلک عالم آئی جی دتے تے بہ بان کھوئی حجرت خدائے بیل آس مردان میں لس دھواسہاب سائی دئے چادر اچائی۔
اتنے ملک کو فرمان پیس کجلی بلاس کے لاس رو ہکنگ دھارگ گھر
۵۲۔ پتر پائے گھالیہ پرتھی راج باندیں سلطان۔ کر سلام تہ بار پری انگلی سلی تنن۔

یہ اگرچہ مختلف جگہہ کے ٹکڑے ہیں۔ مطلب ان کا اصل کتاب
کے دیکھنے سے کھلتا ہے مگر حروف شناس آدمی بھی اتنا جان سکتا ہے
کہ یہ لفظ عربی فارسی کے اس میں موجود ہیں محل۔ پروردگا۔ بگام (پیغام)
کریم۔ سر طان (سلطان) بات شاہ (بادشاہ)۔ دیوان۔ خلک
(خلق۔ عالم۔ حجرت (حضرت) ملک۔ پھرماں (فرمان) سلام۔ ترجمہ اور
تصنیف کے تجربہ کار جانتے ہیں کہ ان کی عبارت میں کسی زبان کا اصل
لفظ جو اپنا مطلب بتاجاتا ہے سطر سطر بھر عبارت میں ترجمہ کریں تو
بھی وہ بات حاصل نہیں ہوتی جو مجموعہ خیالات کا اور اُس کے صفات
ولوازمات کا اس ایک لفظ سے سُننے والے کے سامنے آئینہ ہوجاتا
ہے وہ ہماری سطر بھر سے پورا نہیں ہوتا چند اپنی نظم میں سلطان کی
جگہہ اگر راجہ بلکہ مہاراجہ لکھ دیتا تو بھی جو صفات اور اس کے لوازمات
نیک یا بد۔ رحم یا عدل۔ زور یا ظلم یہ لفظ اس کی نظم میں دکھارہا ہے
وہ بات راجہ مہاراجہ سے ممکن نہیں اسی طرح لفظ سلام کہ اُس کے
مطلب کا حق ڈنڈوت خواہ پرنام کوئی لفظ ادا نہیں کرسکتا۔ نظیر
اس کی آج انگریزی کے سیکڑوں لفظ ہیں اگر ترجمہ کریں تو سطر میں
بھی پورا مطلب نہیں ہوسکتا۔ مثلاً ایک ہندوستانی شخص اپنے دوست

سے کہتا ہے۔ لاٹ صاحب چھ بجے اسٹیشن پر پہونچیں گے پروگرام کے
بموجب شہر کی سیر کریں گے۔ ۵ بجے آتا وہیں چل کر تماشہ دیکھیں گے۔
اب خواہ صحیح بگڑے مگر جو اصلی لفظ آپ اپنے معنی سننے والے کو سمجھا رہے
ہیں کئی کئی سطروں میں ترجمہ کئے جائیں تو بھی حق مطلب بجا نہ لاسکیں
گے۔ آخر پندرہ صدی عیسوی میں کہ سکندر لودی کا زمانہ تھا اتنا ہوا کہ
اوّل کایتھ فارسی پڑھ کر شاہی دفتروں میں داخل ہوئے اور اب
ان لفظوں کو ان کی زبانوں پر آنے کا زیادہ موقع ملا۔ رفتہ رفتہ اکبر کے
عہد سے کہ مسلمان شیر و شکر ہو گئے۔ یہ نوبت ہوئی کہ اُدھر بادشاہ اور
اس کے اعلیٰ درجہ کے اہل دربار نے جبّہ اور دستار کے ساتھ ڈاڑھیوں
کو خدا حافظ کہا اور جامے پہن کر کھڑکی دار پگڑیاں باندھ بیٹھے ادھر
ہندو شرفا بلکہ راجہ مہاراجہ ایرانی لباس پہنے اور فارسی بول کر فخر
کرنے لگے بلکہ مرزا کے خطاب کو بڑے شوق سے لینے لگے۔

اب جس قدر ممکن ہے عہد بعہد کی زبانوں کے نمونے دکھاتا
ہوں۔ امیر خسرو جو کہ ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء میں فوت ہوئے اُن کی ایک غزل نظم
اُردو کی تاریخ میں دیکھو جس کا پہلا مصرع ہے ع زحال مسکیں مکن تغافل
درائے نینا بنائے بتیاں الخ۔ اس سے تمھیں کچھ کچھ حال اس وقت کی
زبان کا بھی معلوم ہوگا۔ خالق باری انھیں کے مخلوقات فکر سے ہے۔

باریک بیں اشخاص اس سے بھی بہت سے الفاظ اور فقرے
دیکھکر یہہ نکتے سمجھ سکتے ہیں ؎

بیابرادر آؤ رے بھائی　　بنشیں مادر بیٹھری مائی

ایک مجرب نسخہ آنکھوں کا دوہروں کی بحر میں کہتے ہیں ؎

لودھ پھٹکری مردہ سنگ　　ہلدی زیرہ ایک ایک ٹنگ
افیون چنا بھر مرچیں چار　　اُرد برابر تھوتا ڈار
پوست کے پانی پوٹلی کرے　　ترت پیر نینوں کی ہرے

نظم اردو کی تاریخ میں ان کی عمدہ پہیلیاں۔ مکرنیاں۔ دو سخنے۔
انمل بیں نے لکھ دئے ہیں اُنھیں دیکھو اور خیال کرو کہ بحریں دوہروں
کی ہیں مگر فارسیت کس قدر اپنا زور دکھا رہی ہے۔

ہندو شاعروں کے دوہرے برج بھاشا میں ہیں۔ مگر عہد بعہد
کی زبان کا پتہ بتاتے ہیں۔ چنانچہ سکندر لودی کے زمانہ میں کبیر شاعر
بنارس کے رہنے والے۔ علم میں اَن پڑھ تھے گرو رامانند کے چیلے
ہوکر ایسے ہوئے کہ خود کبیر پنتھیوں کا مت نکالا۔ تصنیفات اگر جمع ہوں
تو کئی جلدیں ہوں۔ اُن کے دوہروں میں فارسی عربی کے لفظ دیکھو۔

دین گنوایو دُنی سے دُنی نہ آیو ہاتھ　　پیر کلھاڑی ماریو گابھل اپنے ہاتھ
کبیر سر پہ سرای ہے کیوں سوئے سکھ چین　　کوچ نگاڑا سانس کا باجت ہے دن رین

گرو نانک صاحب کی تصنیفات بہت کچھ ہیں۔ اگرچہ خاص قطعہ پنجاب کی زبان ہے۔ مگر جس بہتات سے اُن کے کلام میں عربی فارسی کے لفظ ہیں۔ اتنے کسی کلام میں نہیں اور چونکہ سنہ ۱۵۰۹ء کے بعد فوت ہوئے تو اس سے چار سو برس پہلے کی پنجابی کا نمونہ بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ دوہرا

سانس سانس سب جیو تمہارا　　تو ہے کھرا پیارا
نانک شاعر ایو کہت ہے　　سچے پروردگارا

بلکہ اکثر چیزیں وظیفہ عبادت کے طور پر ہیں۔ ان میں الفاظ مذکورہ اسی کثرت سے نظر آتے ہیں جپ جی کے دو فقرے دیکھو۔

وارن جاؤں ان ایک بار　　تو سدا سلامت جی نرنکار

مسلمان بھی اس زمانہ میں یہاں کی زبان سے محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ سولھویں صدی عیسوی شیر شاہی عہد میں ملک محمد جائسی ایک شاعر ہوا۔ اُس نے پدماوت کی داستان نظم کی۔ اس سے عہد مذکور کی زبان ہی نہیں معلوم ہوتی بلکہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اس ملک میں رہ کر یہاں کی زبان کو کس پیار سے بولنے لگے تھے۔ اُس کی تحریر بھی ہندی رکھی ہے اور ورق کے ورق اُلٹتے چلے جاؤ فارسی عربی کا نام نہیں ملتا۔ مطلب اس کا آج مسلمان بلکہ ہر ایک ہندو بھی

نہیں سمجھتا۔ کتاب مذکور چھپ گئی ہے اور ہر جگہ ملسکتی ہے اسلئے نمونہ نہیں لکھا
ہمایوں نے جب گجرات دکن پر فوج کشی کی تو سلطان بہادر
وہاں کا بادشاہ تھا اور چانپانیر کا قلعہ بہت مستحکم تھا کہ سلطان خود بھی
وہاں رہتا تھا اور تمام خزائن ودفائن وہیں رکھتا تھا۔ محاصرہ کے وقت
رومی خاں میر آتش (باوجودیکہ کمال معتبر اور مصاحب منظور نظر سلطان
کا تھا) ہمایوں سے مل گیا اور قلعہ (تمام نفائس اموال اور خزائن بجسنا
سمیت) ہمایوں کے قبضہ میں آیا۔ سلطان بہادر کے پاس ایک طوطا
تھا کہ آدمی کی طرح باتیں کرتا تھا اور سمجھ کر بات کا جواب دیتا تھا۔
سلطان اُسے ایسا چاہتا تھا کہ سونے کے پنجڑے میں رکھتا تھا اور
ایک دم جُدا نہ کرتا تھا۔ وہ بھی لوٹ میں آیا جب دربار میں لائے تو
رومی خاں بھی موجود تھا طوطے نے دیکھ کر پہچانا اور کہا پھٹ پاپی رومی خاں
نمک حرام۔ سب کو تعجب ہوا۔ اور ہمایوں نے کہا رومی خاں چکنم کہ جانور است
ورنہ زبانش مے بریدم۔ اس نے شرما کر آنکھیں نیچے کرلیں۔ غرض اس
نقل سے یہ ہے کہ اس وقت بھی لوگوں کی زبان پر عربی فارسی کے لفظ
ضرور چڑھے تھے۔ جب ہی طوطے کی زبان سے نمک حرام کا لفظ نکلا۔ جانور
تھا جو سنتا ہوگا وہی بولتا ہوگا۔ سترھویں صدی عیسوی میں باباتلسی داس
برہمن ضلع باندے کے رہنے والے کہ پنڈت بھی تھے اور شاعر بھی

تھے، فقیر بھی تھے۔ انھوں نے راماین کو بھاشا میں اس طرح ترجمہ کیا

کہ وہ لاثانی کتاب مطبوع خاص و عام ہوئی۔ اُن کے دوہروں میں

بہت اور کتاب مذکور میں کہیں کہیں لفظ فارسی عربی کے موجود

ہیں۔ **دوہرا رامایں**

سنکارے سیوک سکل چلے سوامی کہہ پلٹے — گھر تر و تر و پن باگ بڑ ڈیرا دیو لگائے

گھہ لیوا سن پن ہسٹ بولی — کہت بہنگ کاہ بھی کھولی

رام انیک گریب نواجے — لوک بید بر برو برا جے

گنی گریب گرام نر ناگر — پنڈت موٹے ملیں اُجا گر

مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ — تلسی داس گریب کو کوئی نہ پوچھے بات

انھیں دنوں میں سورداس جی نے سری کرشن جی کے ذکر سے

اپنے کلام کو مقبول خاص و عام کیا اُن کی تصنیف میں شاید کوئی شعر

ہوگا کہ فارسی عربی لفظ سے خالی ہوگا۔

مایا دھام دھن ونتا باندھیوں ہوں اس ساج — یعنی ساز

سنت سبھی جانت ہوں تو نہ آیو باج — یعنی باز

کھیت بہت کابے تم تانے سین سی آواج — یعنی آواز

دیو نہ جات پار اُترائی چاہت چڑھن جہاج — یعنی جہاز

لیجئے پار اُتار سُور کوں مہاراج برج راج

بنیں کرت کہت پربھو تم سوں سدا گریب نواج یعنی غریب نواز

خیال کرو کہ جب یہ بزرگانِ مذاہب اپنے دوہروں میں فارسی لفظ بول جاتے تھے تو گفتگو میں عام ہندو لوگ اس سے کچھ زیادہ نہ بولتے ہوں گے۔

آخر میں حُسن و خوبی برج بھاشا کی راجہ جے سنگھ سوائی کی قدردانی سے ظاہر ہوئی۔ اُنھوں نے ایک ایک اشرفی دوہرہ کو دی اور گنوان پنڈتوں کو انعام دیکر دہلی اور نواح دہلی میں شوق پھیلایا۔

اس عہد میں مسلمانوں کی زبان کا کیا حال ہوگا؟ ظاہر ہے کہ کئی سو برس سے اسلام آیا ہوا تھا۔ جن کے باپ دادا کئی کئی پشت یہیں کی خاک سے اُٹھے اور یہیں پیوند زمین ہو گئے۔ انھیں آپس کے رشتوں اور معاملات کے سررشتوں سے ضرور یہاں کی زبان یعنی برج بھاشا بولنی ہوتی ہوگی۔ تازہ ولایت۔ آدھی اپنی آدھی ان کی ملا کر ٹوٹی پھوٹی بولتے ہوں گے۔ ان زمانوں کی کوئی نثر تصنیف نہیں۔ وہی امیر خسرو کی ایک غزل اور پہیلیاں اور مکرنیاں اور گیت پتا بتاتے ہیں کہ ۷۰۰ھ میں یہاں کے مسلمان خاصی بھاشا بولتے ہوں گے بلکہ یہی کلام یہ بھی خبر دیتے ہیں کہ مسلمان بھی اب یہیں کی زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے اور اس زبان کو کس

شوق اور محبت سے بولتے تھے۔ شاید بہ نسبت ہندؤں کے فارسی عربی الفاظ اُن کی زبان پر زیادہ آجاتے ہوں گے اور جتنا یہاں رہنا سہنا اور استقلال زیادہ ہوتا گیا اتنا ہی روز بروز فارسی ترکی نے ضعف اور یہاں کی زبان نے زور پکڑا ہوگا رفتہ رفتہ شاہجہاں کے زمانہ میں کہ اقبال تیموری کا آفتاب عین اوج پہ تھا۔ شہر اور شہرپناہ تعمیر ہو کر نئی دلی دارالخلافت ہوئی۔ بادشاہ اور ارکان دولت زیادہ تر وہاں رہنے لگے۔ اہل سیف۔ اہل قلم۔ اہل حرفہ اور تجار وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے۔ ترکی میں اُردو بازار لشکر کو کہتے ہیں اُردوے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے۔ وہاں کی بولی کا نام اُردو ہو گیا اُسے فقط شاہجہاں کا اقبال کہنا چاہئے کہ یہ زبان خاص و عام میں اُردو کی طرف منسوب ہو گئی۔ ورنہ جو نظم و نثر کی مثالیں بیان ہوئیں۔ اُن سے خیال کو وسعت دیکر کہہ سکتے ہو کہ جس وقت سے مسلمانوں کا قدم ہندوستان میں آیا ہو گا اُسی وقت سے اُن کی زبان نے یہاں کی زبان پہ اثر شروع کر دیا ہو گا چندکوی کا کلام مل گیا جمیں الفاظ موجود ہیں محمود کے وقت کی نظم یا نثر مل جاوے تو اس میں بھی ضرور ہوں گے۔

بیان ہاے مذکورہ سے بھی ثابت ہوا کہ جو کچھ اس میں

ہوا کسی کی تحریک یا ارادے سے نہیں ہوا بلکہ زبان مذکور کی طبیعت
ایسی ملنسار واقع ہوئی ہے کہ ہر زبان سے رِل مِل جاتی ہے ۔
سنسکرت آئی اس سے مل گئی۔ عربی فارسی آئی اس سے بسم اللہ
خیر مقدم کہا۔ اب انگریزی الفاظ کو اس طرح جگہہ دے رہی ہے گویا
اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

اسی زبان کو ریختہ بھی کہتے ہیں کیونکہ مختلف زبانوں نے اُسے
ریختہ کیا ہے ۔ جیسے دیوار کو اینٹ۔ مٹّی۔ چُونا۔ سفیدی وغیرہ ریختہ
کرتے ہیں۔ یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہیں گری پڑی پریشان چیز۔ چونکہ اسمیں
الفاظ پریشان جمع ہیں اس لئے اُسے ریختہ کہتے ہیں۔ یہی سبب ہے
کہ اُس میں عربی۔ فارسی۔ ترکی وغیرہ کئی زبانوں کے الفاظ شامل
ہیں اور اب انگریزی داخل ہوتی جاتی ہے اور ایک وقت ہوگا کہ عربی
فارسی کی طرح انگریزی زبان قالبص ہوجائے گی۔ چنانچہ میں ایک خاندانی
نواب زادے کی گفتگو لکھتا ہوں۔ جس کی پرورش اور تعلیم گھریلو ہے
یعنی نہ عربی نہ فارسی کی لفاظی نے اُس پر رنگ چڑھایا ہے۔ نہ انگریزی
نے روغن پھیرا ہے بلکہ دوستانہ بے تکلفانہ باتیں ہیں "وہ بڑے آکا کی پنشن
لینے کل کچہری گیا تھا۔ ڈپٹی صاحب کے کمرے کے آگے کچھ قرقی کا مال
نیلام ہورہا تھا۔ کرسیاں۔ کوٹ اور واسکٹیں نئی تھیں۔ کنٹر اور گلاس بھی

ولایتی تھے کُرسیاں میزیں۔ چقیں باریک خوش رنگ تھیں میں نے
کہا چلو کوئی ڈھب کی ہیز ہو تو لے لیں منجھلے آکا بولے جانے بھی دو۔
جس مال نے مالک سے وفا نہ کی ہم سے کیا وفا کرے گا۔ آتے
ہوئے ریل کی اسٹیشن کے پاس دیکھتا ہوں۔ کھٹے مرزا جان چلے
آتے ہیں۔ شکرم ٹھہرا کر بڑے تپاک سے ملے۔ بڑھاپے نے بیچارے
کا رنگ روپ سب کھو دیا۔ وہ شکل ہی نہیں۔ وہ صورت ہی نہیں۔
کیسے گورے چٹے سفید جوان تھے۔ لوگ تصویریں اتروا تے تھے
میں نے کہا میاں! ہم نے تو جانا تھا تم دکھن سے خوب چاق۔
چوبند۔ سُرخ سفید ہو کر آؤ گے۔ تم تو سوکھ کر قاق ہو گئے۔ غضب
کیا اگلا جوبن بھی گنوا آئے۔ ٹھنڈا سانس بھر کر بولے ہائے جوانی"
فارسی۔ عربی کے الفاظ تو ظاہر ہیں مگر خیال کیجئے کہ قرق۔ چق۔
چاق۔ قاق آکا ترکی ہیں میز۔ نامعلوم نیلام پرتگالی ہے۔ کمرا۔
اطالی ہے۔ ڈپٹی۔ ریل۔ اسٹیشن۔ کوٹ۔ واسکٹ۔ کنٹر۔ گلاس۔
انگریزی ہیں۔ چپا۔ کھتا۔ پنجابی ہے مگر آتنا ہے کہ ہم چپا بغیر گورے
کے اور اسی طرح چنگا بغیر بھلے کے نہیں بولتے۔ وہ اکیلا ہی بولتے
ہیں۔ کھتا پنجابی میں عام ہے ہم خاص صفت کے ساتھ بولتے
ہیں بھانڈا پھوڑنا۔ اُردو میں کسی بات یا راز کھول دینے کو کہتے ہیں

پنجابی میں باسن کو بھانڈا بھی کہتے ہیں۔ گلا گھونٹنا اُردو میں بولتے ہیں
پنجابی میں کھینچکر باندھنے یا مضبوط پکڑنے کو کہتے ہیں مثلاً گھٹ کر باندھو
یا گھٹ کر پکڑو۔ بھنا۔ بھنانا۔ توڑنا اور تڑوانا ہے اور اسی سبب سے
پنجابی میں روپیہ کے لئے بھی بھنانا کہتے ہیں۔ اُردو میں پہلے معنی
متروک ہوگئے۔ دوسرے معنی رہے وہ بھی ترکوہ کرکے کہ جاؤ روپیہ
کے ٹکے بھنالاؤ اور اس اصلیت کا سراغ یوں لگا کہ فارسی میں روپیہ
کے لئے خورد کردن بولتے ہیں اور اُردو میں کہتے ہیں۔ صبح کو
روپیہ خورد کیا تھا۔ دوپہر دیکھو تو برکت اللہ یعنی سب پیسے اُٹھ گئے۔
کسوٹی۔ گھسنا مرادف فرسودن اُردو میں بالکسر ہے پنجابی میں
اس طرح بولتے ہیں کہ کاف مفتوح معلوم ہوتا ہے اور رہ کا تلفظ عجیب
ہے کہ اُنھیں کے لہجے کے لئے خاص ہے بہر حال اس سے کسوٹی گھسنے
کی ٹبیا) معیار کا نام ہوا اُردو میں بھی لفظ کسوٹی ہوگیا روپ۔ بھیلا جوبن
گنوایا برج بھاشا ہے۔ ان کے علاوہ روزمرہ کی باتوں پر خیال کرو
یوسف۔ ہارون۔ موسیٰ۔ عیسیٰ وغیرہ عبرانی ہیں کیمیا۔ فیلسوف
اصطرلاب یونانی ہیں۔ اُردو یعنی ماش تامل ہے نہنا یعنی خود گجراتی ہے
بڑا جو کڑھائی میں تلتے ہو۔ تلنگہ ہے۔ گدام ملایا کی زبان ہے تما کو
اصل میں سنسکرت ہے تامرکٹ کا بگاڑا ہوا ہے۔ بے کتا ہو تو تامرتیر

سکتے ہیں۔

اُردو میں اُسوقت نثر کی کوئی کتاب نہ لکھی گئی۔ جس سے سلسلۂ اُن تبدیلیوں کا معلوم ہو میر جعفر زٹل کے کلام کو میں محمد شاہی بلکہ اس سے پہلے زمانہ کا نمونہ کہتا مگر زٹل کا اعتبار کیا؟ البتہ محمد شاہ کے عہد میں ۱۱۴۵ھ میں فضلی تخلص ایک بزرگ نے دہ مجلس لکھی۔ اس کے دیباچہ میں سبب تالیف لکھتے ہیں اور غالباً یہی نثر اُردو کی پہلی تصنیف ہے "پھر دل میں گزرا کہ ایسے کام میں عقل چاہئے کامل۔ اور مدد کسو طرف کی ہوئے شامل کیونکہ بے تائید صمدی مدد جناب احمدی۔ یہ مشکل صورت پذیر نہ ہوئے اور گوہر مراد رشتہ امید میں نہ آدے کہ ہنداکوئی نہیں ہوا اس صنعت کا مخترع اور اب تک ترجمہ فارسی بعبارت ہندی نثر نہیں ہوا مستمع۔ پس اس اندیشہ عمیق میں غوطہ کھایا اور بیابان تامل وتدبیر میں سرگشتہ ہوا۔ لیکن راہ مقصود کی نہ پائی ناگاہ نسیم عنایت الٰہی دل افگار پر اہتزاز میں آیہ بات آئینہ خاطر مُنہ میں دکھلائی"۔

میر کی مثنوی شعلۂ عشق کے مضمون کو بھی مرزا رفیع نے نثر میں لکھا ہے افسوس کہ اس وقت موجود نہیں۔ اُس کا انداز بالکل یہی ہے لیکن چند فقرے سودا کے ایک دیباچہ سے لکھتا ہوں جو کلیات میں موجود ہیں۔ نثر مرزا رفیع ضمیر منیر پر آئینہ داران معنی کے مبرہن ہو کہ

محض عنایت حق تعالیٰ کی ہے جو طوطی ناطقہ شیریں سخن ہو پس یہ
چند مصرعے کہ از قبیل ریختہ دُر ریختہ خامہ دوزبان اپنی سے صفحہ کاغذ پر
تحریر پائے۔ لازم ہے کہ تحویل سخن سامعہ سنجان روزگار کروں۔ تا
زبانی اُن اشخاص کی ہمیشہ مورد تحسین و آفریں رہوں ۔

قیمت قدر شناسا ہی سے پہونچے ہی بہم   ورنہ دنیا میں خزف بھی نہیں گوہر سے کم

مضمون سینہ میں بیش از مرغ اسیر نہیں کہ ہو بیچ قفس کے۔ جو وقت
زبان پر آیا فریاد بلبل ہے واسطے گوش دادرس کے۔ غرض جب اہل
سخن کا دُر منصفی زینت لب ہے۔ سر رشتہ معانی کا اس کلام کے اُس سے
انصاف طلب ہے اگر حق تعالیٰ نے صبح کاغذ سفید کی مانند شام سیاہ
کرنے کو یہ خاکسار خلق کیا ہے تو ہر انسان کے فانوس دماغ میں چراغ
ہوش دیا ہے چاہئے کہ دیکھ کر نکتہ چینی کرے ورنہ گزند زہر آلود سے بے
اجل کا ہے کو مرے "

اس تصنیف سے تخمیناً ۳۰ برس کے بعد جبکہ میر انشا اللہ خاں اور
مرزا جان جاناں مظہر کی دلّی میں ملاقات ہوئی ہے اُس گفتگو کے چند
فقرے بھی قابل غور ہیں سید انشا مرزا جان جاناں سے فرماتے ہیں۔

سید انشا فرماتے ہیں

"ابتدائے سن صبا سے تا اوائل ریعان اور اوائل ریعان سے الی الآن۔ اشتیاق مالا الطاق تقبیل عتبۂ عالیہ نہ بحدے تھا کہ سلک تحریر و تقریر میں منتظم ہو سکے لہذا بے واسطہ و وسیلہ حاضر ہوا ہوں"

مرزا صاحب جواب میں فرماتے ہیں

"اپنے تئیں کون بھی بدو طفلی سے تمہیں ایسے اشخاص کے ساتھ موانست اور مجالست رہا کی ہے" لیکن میر غفر غینی کے نام سے ایک گفتگو سید انشا نے دریائے لطافت میں لکھی ہے اسے پڑھ کر تعجب آتا ہے کہ صاحب کمال نے یہ زبان کس فصاحت کے قالب میں ڈھالی تھی کہ ان عبارتوں میں عجیب لطف یہ ہے کہ زبان اردو کی عام فہمی دیکھ کر مذہب نے بھی اپنی برکت کا ہاتھ اس کے سر پر رکھا یعنی ۱۲۲۲ھ میں مولوی شاہ عبد القادر نے قرآن شریف کا ترجمہ اردو میں کیا بعد اس کے مولوی اسمٰعیل صاحب نے بعض رسالے عام اہل اسلام کی فہمائش کے لئے اردو میں لکھے۔

۱۸۳۵ء سے دفاتر سرکاری بھی اُردو ہونے شروع ہوئے۔ چندسال کے بعد کل دفتروں میں اُردو زبان ہوگئی۔ اسی سنہ میں اخباروں کو آزادی ہوئی۔ ۱۸۳۶ء میں اُردو کا اخبار دلّی میں جاری ہوا اور یہ اس زبان میں پہلا اخبار تھا کہ میرے والد مرحوم کی قلم سے نکلا۔

غرض اپنی آسانی کے وصف سے اور اس لحاظ سے کہ ملکی زبان یہی ہے، دفتری زبان بھی یہی ٹھہری۔ اُردو نے آہستہ آہستہ فارسی کو پیچھے ہٹانا اور اپنا قدم آگے بڑھانا شروع کیا۔ تب سرکار نے مناسب سمجھا کہ اس ملک کے لوگوں کو اُنھیں کی زبان میں انگریزی علوم وفنون سکھلائے جائیں چنانچہ ۱۸۴۲ء سے دلّی میں سوسائٹی قائم ہوکر ترجمے ہونے لگے اور ضرورت علمی الفاظ بہم پہونچانے لگی۔ خیال کرو کہ جس زبان کی فقط اتنی بنیاد ہو وہ زبان کیا اور اس کی وسعت کا میدان کیا۔ البتہ اب امید کرسکتے ہیں کہ شاید یہ بھی ایک دن علمی زبانوں کے سلسلہ میں کوئی درجہ پائے۔

اُردو اس قدر جلد جلد رنگ بدل رہی ہے کہ ایک منصف اگر خود اپنی ایک سنہ کی تصنیف کو دوسرے سن کی تصنیف سے مقابلہ کرے تو زبان میں فرق پائے گا۔ باوجود اس کے اب تک بھی اس

قابل نہیں کہ ہر قسم کے مضمون خاطر خواہ ادا کر سکے یا ہر علم کی کتاب کو بے تکلف ترجمہ کر دے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اکثر علوم اور ہزاروں مسائل علمی ممالک فرنگ میں ایسے نکلے ہیں کہ زمانہ سلف میں بالکل نہ تھے۔ اس واسطے عربی۔ فارسی۔ سنسکرت۔ بھاشا وغیرہ جو کہ اُردو کے بزرگ ہیں اُن کے خزانے میں بھی اس کے ادائے مطلب کے لئے لفظ نہیں اور اس میں ہم اُردو بیچاری کے افلاس پر چنداں تعجب نہیں کر سکتے۔ خصوصاً جبکہ ہندو مسلمان اپنے اپنے بزرگوں کی میراث کو بھی ہاتھ سے کھوئے بیٹھے ہوں اور اس میں زمین و آسمان کا فرق ہے شاید مرزا جان جاناں اور سودا وغیرہ بزرگوں کی تحریر کچھ اور ہوگی تقریر کا اندازہ اور ہوگا۔

بہر حال اس وقت تک انشا پردازی اور ترقی اور وسعت زبان اُردو کی فقط شعرا کی زبان پر تھی جن کی تصنیفات غزلیں عاشقانہ اور قصیدے مدحیہ ہوتے تھے اور غرض ان سے فقط اتنی تھی کہ امرا و اہل دول سے انعام لے کر گذارہ کریں۔ یا تفریح طبع۔ یا یہ کہ ہم چشموں میں تحسین و آفریں کا فخر حاصل کریں وہ بھی فقط نظم میں نثر کے حال پر کسی کو اصلا توجہ نہ تھی کیونکہ کار روائی مطالب ضروری کی سب فارسی میں ہوتی تھیں مگر خدا کی قدرت دیکھو تھوڑے

عرصہ میں کئی قدرتی سامان جمع ہو گئے اور سب سے مقدم سبب اس کی عام فہمی تھی کہ ہر شخص سمجھتا تھا۔ اس لئے لکھنے والوں کو اسی میں واہ واہ لینے کا شوق ہوا امیر **محمد عطا حسین خاں تحسین** نے چار درویش کا قصہ اُردو میں لکھ کر **نوطرز مرصع** نام رکھا شجاع الدولہ کے عہد میں تصنیف ہوئی۔ ۱۷۹۸ء ۱۲۱۳ھ نواب آصف الدولہ کے عہد میں ختم ہوئی۔

ادھر تو یہ چونچال لڑکا شعرا کے جلسوں میں اور امرا کے دربار میں اپنی بچپنے کی شوخیوں سے سب کے دل بہلا رہا تھا اُدھر دانائے فرنگ جو کہ کلکتہ میں فورٹ ولیم کے قلعہ پر دوربین لگائے بیٹھا تھا اُس نے دیکھا۔ نظرباز تاڑ گیا کہ لڑکا ہونہار ہے مگر تربیت چاہتا ہے۔ تجویز ہوئی کہ جس ملک پر حکمرانی کرتے ہیں اُس کی زبان سیکھنی واجب ہے چنانچہ ۱۷۹۹ء ۱۲۱۴ھ میں میر شیر علی افسوس نے **باغ اُردو** اور ۱۸۰۵ء ۱۲۲۰ھ میں **آرایش محفل** لکھی۔ **میر امن دہلوی** نے ۱۸۰۱ء ۱۲۱۶ھ میں **باغ و بہار** آراستہ کیا اور انھیں دنوں میں اخلاق محسنی کا ترجمہ لکھا۔ ساتھ ہی جان گلکرسٹ صاحب نے انگریزی میں قواعد اُردو لکھی ۱۸۰۳ء ۱۲۱۸ھ میں **شری للو جی لال کوی** نے **پریم ساگر** لکھی اور **بیتال پچیسی** جو محمد شاہ کے زمانہ میں سنسکرت سے برج بھاشا میں آئی

تھی اب عام فہم اُردو میں ہو کر ناگری میں لکھی گئی لیکن اس نقارہ فخر کی آواز کو کوئی دبا نہیں سکتا کہ **میر انشاء اللہ خاں** پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۸۰۷ء ۱۲۲۲ھ میں **قواعد اردو** لکھ کر ایجاد کی ٹہنی میں ظرافت کے پھول کھلائے۔

برج بھاشا پر عربی اور فارسی زبانوں نے کیا کیا اثر کئے

جب دو صاحب زبان قومیں باہم ملتی ہیں تو ایک کے رنگ روپ کا دوسرے پر ضرور سایہ پڑتا ہے اگرچہ اس کے اثر۔ گفتگو لباس۔ خوراک نشست برخاست۔ مختلف رسوم میں بھی ہوتے ہیں لیکن چونکہ مجھے اس مقام پر زبان سے غرض ہے اس لئے اس میں گفتگو کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم میں آتی ہے تو اپنے ملک کی صدہا چیزیں ایسی لاتی ہے کہ جو یہاں نہیں تھیں۔ اشیاء مذکورہ کبھی ضروری اور کبھی ایسی باعث آرام ہوتی ہیں کہ اُنھیں استعمال میں لینا ضروریات زندگی سے نظر آتا ہے اس لئے یہ لوگ اُنھیں غنیمت سمجھ کر لیتے ہیں اور بخوشی کام میں لاتے ہیں ان اشیا میں سے بہتیری چیزیں تو اپنے نام اپنے ساتھ لاتی ہیں اور بہتیری نئی ترکیب سے یا ادل بدل کر یہاں نیا نام پاتی ہیں اور یہ پہلا اثر دوسری زبان کا ہے اس کے علاوہ جب یہ دونوں ایک جگہ رہ سہکر شیر و شکر ہوتی ہیں تو ایک زبان میں دوسری زبان کے لفظ بھی گُھل مل جاتے ہیں۔

جب مہمان و میزبان ایک دوسرے کی زبان سمجھنے لگتے ہیں تو ایک خوشنما اور مفید تبدیلی کے لئے رستہ پیدا ہوتا ہے کیونکہ اگرچہ طبع انسانی

کے اتحاد سے سب کے خیالات متفق یا قریب قریب ہوں، مگر انداز بیان سب
کا جُدا جُدا ہے اور طبیعت ہمیشہ نئے انداز پسند کرتی ہے اِس لئے اداے
مطالب میں ایک دوسرے کے انداز بیان سے بھی فائدہ اُٹھاتے ہیں۔
پھر نئی نئی تشبیہیں لطیف استعارے لے کر اپنی پُرانی تشبیہوں اور مستعمل
استعاروں کا رنگ بدلتے ہیں اور جس قدر زبان میں طاقت ہے
ایک دوسرے کے خیالات اور نئی طرز کو لے کر اپنی زبان میں نیا
مزا پیدا کرتے ہیں۔
یہ انقلاب حقیقت میں وقت بوقت ہر ایک زبان پر گذرتا ہے۔
چنانچہ قوم عرب نے جو ایک زمانہ میں۔ روم۔ یونان اور ہسپانیہ
وغیرہ سے خلط ملط ہوئی تھی۔ ہزاروں لفظ علمی اور غیر علمی وہاں سے
لئے اِسی طرح فارسی زبان عربی و ترکی وغیرہ الفاظ سے مالا مال
نظر آتی ہے اِنگریزی کے باب میں مجھے کچھ کہنا زیبا نہیں۔ کیونکہ
اب روشنضمیر انگریزی خواں بہت ہیں اور وہ مجھ سے زیادہ جانتے
ہیں مگر اتنا کہنا کافی ہے کہ جس طرح ایک مہذب سلطنت کو تمام ضروریات
سلطنت کے کارخانے اور ملکی سامان موجود ہونے چاہئیں۔ اِسی
طرح سب قسم کے الفاظ اور تمام اداے خیالات کے انداز انگریزی زبان
میں موجود ہیں اب مجھے اپنی زبان میں گفتگو کرنی چاہئے لیکن اِتنا پھر

یاد دلانا واجب ہے کہ اُردو کہاں سے نکلی ہے اور کیونکر نکلی ہے۔
اُردو زبان اوّل۔ لین دین نشست برخاست کی ضرورتوں کے لئے
پیدا ہوگئی۔ ہندؤں کے ساتھ ہندی مسلمان جو اکثر ایرانیوں یا ترکستانیوں
کی اولاد تھی۔ ہندوستان کو وطن اور اس زبان کو اپنی زبان سمجھنے
لگے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جسطرح زمین بے روئیدگی کے نہیں رہ سکتی
اسی طرح کوئی زبان بے شاعری کے نہیں رہ سکتی۔ محمد شاہی دور
تھا اور عیش و عشرت کی بہار تھی۔ ان شرفاء کو خیال آیا ہوگا کہ جسطرح ہمارے
بزرگ اپنی فارس کی انشا پردازی میں گلزار کھلاتے تھے۔ اب ہماری
یہی زبان ہے ہم بھی اس میں کچھ رنگ دکھائیں چنانچہ وہی فارسی
کے خاکے اُردو میں اُتار کر غزلخوانیاں شروع کر دیں اور قصیدے
کہنے لگے اور اسمیں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ قوت بیان یا لفظوں کی
تراش یا ترکیبوں کی خوبصورتی یا تشبیہ اور استعاروں کی رنگینی غرض
اوّل جو کچھ نصیب ہوا شعرائے اُردو کی بدولت ہوا اور یہی سبب ہے
کہ جو کچھ سامان ایک مُلکی اور ٹکسالی زبان کے لئے درکار ہوتے ہیں اُس
سے یہ زبان مفلس رہی کیونکہ اس عہد میں علوم و فنون تاریخ فلسفہ ریاضی
وغیرہ کا چرچا عام ہوتا تو اس کے لئے بھی الفاظ ہو جاتے جن جن باتوں
کا چرچا تھا اُن ہی سامانوں کے الفاظ اور خیالات پیدا ہوئے

ہاں یہ کہنا ضرور چاہئے کہ جو کچھ ہوا تھا اپنے رنگ پر خوب ہوا تھا۔

اب ہمیں پھر مطلب پر آنا چاہئے کہ بھاشا نے اُردو کے کپڑے پہننے کے لئے فارسی سے کیا کیا لیا۔

ا۔ اُن چیزوں کے نام لئے جو عرب اور فارس سے آئیں اور اپنے نام اپنے ساتھ لائیں مثلاً لباس میں فرغل۔ لبادہ۔ کرتہ۔ قبا۔ چوغا۔ آستین۔ گریبان۔ پائجامہ۔ ازار۔ عمامہ۔ رومال۔ شال۔ دوشالہ تکیہ۔ گاؤتکیہ۔ برقع۔ پوستین۔ وغیرہ۔

کھانے کے ذیل میں۔ دسترخوان۔ چپاتی۔ شیرمال۔ باقرخانی پلاؤ۔ زردہ۔ مزعفر۔ قلیہ۔ قورمہ۔ تنجن۔ فرنی یاقوتی۔ حریرہ۔ حلیسہ۔ نور۔ مربّے۔ اچار۔ فالودہ۔ گلاب۔ بیدمشک۔ خوان۔ طبق۔ رکابی تشتری۔ کفگیر۔ چمچہ۔ سینی۔ کشتی۔ چاے جوش وغیرہ۔

متفرقات میں۔ حمام۔ کیسہ۔ صابون۔ شیشہ۔ شمع۔ شمعدان۔ فانوس۔ گلگیر۔ تنور۔ رفیدہ۔ مشک۔ نماز۔ روزہ۔ عید۔ شب برات۔ قاضی۔ ساقی۔ حقہ۔ نیچہ۔ چلم۔ تفنگ۔ بندوق۔ تختہ نرد۔ گنجفہ۔ اور اُنکی اصطلاحیں یہ سب چیزیں اپنے نام ساتھ لے کر آئیں۔ بہت سی چیزیں آئیں کہ بھاشا میں اُن کے نام نہیں سنسکرت کی کتابوں میں ہوں گے۔ پستہ۔ بادام۔ منقّے۔ شہتوت۔ بیدانہ۔ خوبانی۔ انجیر۔ سیب۔

بہی۔ ناشپاتی۔ انار وغیرہ۔

۲۔ بہت سے عربی فارسی کے لفظ کثرت استعمال سے اس طرح جگہہ پکڑ بیٹھے ہیں کہ اب ان کی جگہہ کوئی سنسکرت یا قدیمی بھاشا کا لفظ ڈھونڈ کر لانا پڑتا ہے۔ مگر اس میں یا تو مطلب اصلی فوت ہو جاتا ہے یا زبان ایسی مشکل ہو جاتی ہے کہ عوام تو کیا خواص ہنود کی سمجھ میں نہیں آتی مثلاً دلّال۔ فرّاش۔ مزدور۔ وکیل۔ جلّاد۔ صرّاف۔ مسخرا۔ نصیحت۔ لحاف۔ توشک۔ چادر۔ صورت شکل۔ چہرہ۔ طبیعت۔ مزاج۔ برف۔ فاختہ۔ قمری۔ کبوتر۔ بلبل۔ طوطہ۔ پر۔ دوات۔ قلم۔ سیاہی۔ جلّاب۔ رقعہ۔ عینک۔ صندوق۔ کُرسی۔ تخت۔ لگام۔ رکاب زین۔ تنگ۔ پوزی۔ لعل۔ کوتل۔ عقیدہ۔ وفا۔ جہاز۔ مستول بادبان۔ تہمت۔ درہ۔ پردہ۔ دالان۔ تہ خانہ۔ تنخواہ۔ ملّاح۔ تازہ غلط۔ صحیح۔ رسد۔ سرباری۔ کاریگر۔ ترازو۔ شطرنج کے باب میں تعجب ہے کہ خاص ہند کا ایجاد ہے مگر عرب اور فارس سے جو پھر کر آئی۔ تو سب اجزا کے نام اور اپنی اصطلاحیں بدل آئی۔

سیکڑوں لفظ عربی فارسی کے یہاں آئے مگر ہوا موافق نہ آئی اس لئے مزاج اور صورت بگڑ گئی مثلاً مُرغا وغیرہ۔

صرف میں فارسی سے کچھ نہیں لیا۔ خود اتنا کیا کہ نون علامت

جمع ہندی کو عربی فارسی لفظوں پر بھی لگا لیا مثلاً آدمیوں۔ انسانوں
درختوں۔ میووں۔

اسم فاعل۔ فارسی و عربی کے بے شمار لئے اور اُن میں شطرنج
باز کے قیاس پر جو پر باز اور وفادار کے قیاس پر طرف دار سمجھدار
سمجھ ناک بھی بول دیتے ہیں۔ باغبان کے قیاس پر۔ گاڑی بان۔
ہاتھی بان۔ بہل بان۔ مگر بان اور واں حقیقت میں ایک ہیں
کیونکہ اصل میں دونوں زبانیں ایک دادا کی اولاد ہیں۔ اس کی
تحقیق جیسی کہ چاہئے میں نے فارسی لکچروں میں لکھی ہے۔

اسم ظرف۔ قلمدان وغیرہ کے قیاس پر۔ خاصدان۔ پاندان
ناگردان۔ پیکدان۔ مودی خانہ۔ پیخانہ۔

باب حروف۔ کا بھی یہی حال ہے مثلاً حرف تشبیہ کوئی
نہیں لیا مگر۔ چنانچہ اور چونکہ موجود ہیں اور اس طرح آتے ہیں کہ
ترجمہ کے لئے ہندی حرف معلوم ہی نہیں ہوتا۔

حرف شرط میں۔ اگر اور اس سے اگرچہ بھی لیا۔

واو عاطفہ۔ سمیت۔ معطوف اور معطوف علیہ۔ اُردو عبارت
میں لے لئے مثلاً آب و ہوا۔ شب و روز۔ صبح و شام۔ زور شور۔

حرف استثنا۔ میں سے مگر اور عربی کے لفظ سوا۔ ماسوا

الا۔ والانہ۔ لیکن ولیکن رہے سہے اپنے حرفوں کو گم کر دیا۔

حروف نفی۔ نا اور بنا کی جگہہ نہ اور نے آ گئے۔

حروف ایجاب رہے مگر اوب کی جگہہ میں۔ ست بچن وغیرہ کی جگہہ بجا۔ درست۔ واقعی۔ حق۔ بے شک۔ برحق۔ بر سر و چشم آگئے۔ اصل زبان کے لفظ نہ رہے۔

حروف تاکید کی جگہہ ہرگز۔ زنہار۔ ضرور۔ البتہ آگئے اصل لفظ گم ہو گئے۔

حروف تردید کی جگہہ یا۔ خواہ ہیں اصل گم۔

حروف تمنا میں سے کوئی حرف نہیں کاش فارسی کا لفظ ہے

حروف ترقی میں بل تو نہیں بولتے مگر بلکہ اپنے موقع پر آتا ہے

اسم کی بحث میں اسماء اشارہ میں سے کچھ نہیں لیا مگر از انجا کہ۔ باآنکہ۔ بااینکہ مرکب ہو کر بہت آتے ہیں۔

موصولات میں سے کچھ نہیں لیا۔ مگر **کاف بیانیہ** اس طرح آنے لگا کہ بے اُس کے کلام ہی بے مزہ ہو جاتا ہے۔ کیسا ایسا۔ جیسا۔ کی جگہہ کس طرح وغیرہ کس وضع وغیرہ۔ کتنا۔ اتنا۔ جتنا۔ کی جگہ کس قدر وغیرہ بھی بولنے لگے۔

یائے نسبت کی ترکیبوں میں فارسی عربی کے بموجب نسبتی

الفاظ بولنے لگے چنانچہ دلّی وال کی جگہ دہلوی بولتے ہیں اسی طرح اور الفاظ میں۔ اور عورتوں میں شیخانی۔ سیدانی۔ اُستانی۔ وغیرہ وغیرہ۔ باوجودیکہ ہندی کے مصدر موجود تھے مگر صدہا مصادر مرکبہ بنائے مثلاً ماننا۔ اب کہتے ہیں ہر چند سمجھایا۔ اُس نے منظور نہ کیا۔ کسی عنوان میں قبول نہ کیا یعنی نہ مانا مکرنا۔ اب کہتے ہیں پہلے تو قبول دیا تھا پھر انکار کر گیا یعنی مکر گیا۔ سوچنا اب کہتے ہیں ہر چند کہتا ہوں۔ عقل کام نہیں کرتی۔ پچتانا۔ اپنے کیے پر بہت پشیمان ہوا مگر اب کیا ہو سکتا ہے یعنی پچتایا۔

اسی طرح خوش ہونا غصّے ہونا۔ خفا ہونا۔ تنگ ہونا۔ دق ہونا۔ غمگین ہونا۔ تماشا دیکھنا۔ سیر کرنی۔ انتظار کرنا۔ راہ دیکھنا یہاں تک کہ بہتیرے مصدروں کی اصل ہندی گم ہوگئی۔ اس سے بڑھکر یہ کہ عربی فارسی کے مصدر یا مشتقات لے کر ہندی کا اشتقاق کر لیا۔

گذشتن سے گذرنا اور اس کے افعال محاورہ ہے کہ گئی گذری بات کا کیا کہنا۔

فرمودن سے فرمانا اور اُس کے بہت سے افعال۔

قبول سے قبولنا۔ محاورہ ہے بڑا بادی چور تھا ہرگز نہ قبولا۔

بدل سے بدلنا اور اس کے بہت سے افعال۔ محاورہ ہے
کہ اولے کا بدلا ہے صاحب!

بخشیدن سے بخشنا۔ **لرزیدن** سے لرزنا۔

نواختن یا نوازش سے نوازنا۔ **شرم** سے شرمانا۔

کاہلی سے کہلانا میاں مجبور ایک قدیمی شاعر تھے۔ اُستاد
مرحوم ان کی باتیں کیا کرتے تھے کہ بڈھے دیرینہ سال تھے مکتب میں
پڑھایا کرتے تھے ایک دفعہ مشاعرے میں غزل پڑھی دیکھنا کس
خوبصورتی سے فعل مشتق کو بٹھایا ہے ؎

باتیں دیکھ زمانہ کی جی بات سے بھی کہلاتا ہے
خاطر سے سب یاروں کی مجبور غزل کہلاتا ہے

نحو میں ترکیب اضافی ترکیب توصیفی کہیں مبتدا کہیں خبر ہو کر تمام ہندی
پر چھا گئی۔ اس میں پہلا فائدہ یہ ہوا کہ اختصار کے لحاظ سے
لفظوں کا پھیلاؤ کم ہو گیا۔

دوسرے جمع موصوف ہو تو اسم صفت موصوف کو
بھی اس کے لئے جمع لاتے تھے۔ اب واحد لاتے ہیں ؎

ملائم ہو گئیں دلبر برو کی ساعتیں کڑیاں
پھر کٹنے لگے اُن بن نہ کٹتیں جن بنا گھڑیاں

تیسرے ۔ صیغہ مضارع معنی حال ۔ سوداؔ

نالہ سینہ سے کرے عزم سفر آخر شب

راہ رو چلنے پہ باندھے ہے کمر آخر شب

چوتھے ۔ یہ کہ اقسام اضافہ میں تشبیہ اور استعارہ کے رنگ سے سیدھی سادی زبان رنگین ہوگئی چنانچہ بھاشا ہیں کہنا ہو تو کہیں گے راج کنور کے دل کے کنول کی کملاہٹ دربار کے لوگوں سے نہ دیکھی گئی اردو میں کہیں گے شہزادہ کے غنچۂ دل کی کملاہٹ اہل دربار سے نہ دیکھی گئی۔

ولی ۔ وغیرہ متقدمین کے کلاموں میں ایسی ترکیبیں بہت ہیں بلکہ آدھے آدھے اور سارے سارے مصرعہ فارسی کے ہیں۔ مگر کچھ اور طرح سے علیٰ ہذالقیاس بھاشا کے الفاظ اور اس کی ترکیبیں بھی زیادہ ہیں اور اس طرح ہیں کہ آج لوگوں کو فصیح نہیں معلوم ہوتیں۔ اس کی مثال ایسی ہے گویا دودھ میں مٹھاس آئی مگر وہ ابھی اچھی طرح گھلی نہیں۔ ایک گھونٹ خاصہ میٹھا۔ ایک بالکل پھیکا ہے پھر ایک میں مصری کی ڈلی دانت تلے آگئی۔ ہاں اب گھل مل کر وہ مرتبہ حاصل ہوا جسے شیر و شکر کہتے ہیں بعض شخص یہ بھی کہتے ہیں کہ خالی بھاشا میں کچھ مزہ نہیں اردو خواہ مخواہ طبیعت

کو بھلی معلوم ہوتی ہے مگر میری عقل دونوں باتوں میں حیران ہے کیونکہ جب کوئی کہے آج ایک شخص آیا تھا یا یہ کہیں کہ ایک منش آیا تھا۔ تو دونوں یکساں ہیں کیونکر کہوں کہ منش مخالف طبع ہے؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم بچپن سے شخص سنتے ہیں اس لئے ہمیں منش یا مانس نامانوس معلوم ہوتا ہے اسی طرح اور الفاظ جنکی تعداد شمار سے باہر ہوگئی ہے اس سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ بہت سے لفظ خود متروک ہیں مگر دوسرے لفظ سے ترکیب پاکر ایسے ہو جاتے ہیں کہ فصحا کے محاورہ میں جان ڈالتے ہیں مثلاً یہی مانس کہ اکیلا محاورہ میں نہیں مگر سب بولتے ہیں کہ احمد ظاہر میں تو بھلا مانس معلوم ہوتا ہے باطن کی خبر نہیں۔

بندھو بھاشا میں بھائی یا دوست کو کہتے ہیں اب بھائی بند محاورہ میں کہتے ہیں نہ فقط بندھو نہ بھائی بندھو اور ان استعمالوں کی ترجیح کے لئے دلیل کسی کے پاس نہیں جو کچھ زمانہ میں رواج ہو گیا۔ وہی فصیح ہو گیا اب ایک زمانہ آئیگا کہ ہمارے محاورہ کو لوگ بے محاورہ کہکر ہنسیں گے۔

اگرچہ یہ باب بغیر تمثیل دیکھنے کے بھی ہر شخص کے خیال میں نقش ہے کہ سنسکرت اور برج بھاشا کی مٹی سے اُردو کا

پُتلا بنا ہے۔ باقی اور زبانوں کے الفاظ نے خط و خال کا کام کیا ہے
مگر مَیں چند لفظ مثالاً لکھتا ہوں۔ دیکھو سنسکرت الفاظ جب اُردو
میں آئے تو ان کی اصلیت نے انقلاب زمانہ کے ساتھ کیونکر
صورت بدلی ہے۔

۱۔ چورن سنسکرت ہے یعنی آٹا بھاشا میں چوَن کہتے ہیں
اُردو میں چورن پسی ہوئی دوا کو کہتے ہیں اور کُٹی ہوئی چیز کے
نیچے جو باریک اجزا رہ جائیں وہ چورا ہے۔

۲۔ پشٹ سنسکرت ہے بھاشا میں پسان اسی سے ہے
پسہاری اُردو میں ہے۔
پیٹھی پسی ہوئی دال کے لئے ہوگئی اور پیسنا مصدر ہوگیا

۳۔ اٹ جسے برج بھاشا اور اُردو دونوں میں آٹا کہتے
ہیں۔

۴۔ وارتا یا ورت اُردو میں بات ہوگئی۔

۵۔ چتر دھر۔ اُردو میں چودھری ہوگیا۔

۶۔ چندر۔ چاندری سنسکرت ہے اُردو میں چاند اور چاندنی
ہوگئیں۔

۷۔ (گڈھ) گرڑھ۔ گھر یا خانہ اور کیا عجب ہے کہ

فارسی میں کد یا کدھ بھی یہی ہو۔

۸۔ **ہست** ہاتھ ہے۔

۹۔ **ہستی** کا ہاتھی ہوگیا۔

۱۰۔ **بازد**۔ سنسکرت سے بھاشا بادر اُردو بادل یعنی ابر ہوگیا۔

۱۱۔ **دَل**۔ ایک ایک چیز کے دو دو ٹکڑے کرنے کو کہتے ہیں بھاشا اور اُردو میں دال خاص غلہ کے لئے اور دلنا مصدر نکل آیا۔

۱۲۔ **کشیر**۔ دودھ بھاشا کھیر یا چھیر اُردو میں دودھ چاول سے طیار ہوتی ہے۔

۱۳۔ **ڈگدھ**۔ سنسکرت سے بھاشا دودھ ہوا اب اردو دودھ کہتے ہیں۔

۱۴۔ **ماش** یا ماگھ۔ ماس۔ اُردو میں مہینا ہوگیا۔

۱۵۔ **گانڈا**۔ اُردو میں گنا ہوگیا مگر گنڈیری میں ڈال باقی رہی۔

بہت سے الفاظ ہیں کہ عربی فارسی نے اُردو کو دئے اُردو نے کہیں تو لفظوں میں کچھ تصرف کیا۔ معنی وہی رکھے کہیں لفظوں کو سلامت رکھا کچھ سے کچھ کر لئے مثلاً۔

فیلسوف۔ یونانی لفظ ہے بمعنی محب الحکمت جسے عربی میں

حکیم اور انگریزی میں ڈاکٹر یا فلوزفر کہتے ہیں مگر اُردو والے دغاباز اور مکّار کو کہتے ہیں اور فیلسوفی مکّاری۔

اَبّا۔ امّا اب اور اُم سے نکلے ہیں۔

خصم عربی میں بمعنی مقابل یا دشمن ہے مگر اُردو میں خاوند بمقابل جورو کے ہے جس سے زیادہ کوئی دنیا میں عزیز نہیں

تماشا۔ سیر۔ عربی میں فقط بمعنی رفتار ہے اُردو میں کہتے ہیں چلو باغ کی سیر دیکھ آئیں عجب تماشا ہے۔

اخلاص عربی میں خالص کرنے کو کہتے ہیں اُردو والے پیار۔ اخلاص۔ محبت ایک معنوں میں بولتے ہیں۔

خیرات عربی لفظ ہے یعنی نیکیاں۔ اُردو میں خیرات دو صدقہ اتارو۔

تکرار عربی میں دوبارہ کہنے یا کام کرنے کو کہتے ہیں اُردو میں نزاع یا جھگڑے کو کہتے ہیں۔

روزگار فارسی میں زمانہ کو کہتے ہیں ہندی میں روزگار نوکری ہے۔

رومال جن معنوں میں یہاں بولتے ہیں یہ یہیں کا ایجاد ہے۔ فارسی میں روپاک۔ یا دست پاک ہے۔

خیر و صلاح عوام الناس خیر سلا کہتے ہیں یعنی صحت و سلامت۔

رسد۔ اگرچہ فارسی لفظ معلوم ہوتا ہے مگر اہلِ فارس ان معنوں میں نہیں بولتے۔

بہت سے الفاظ اس طرح لئے کہ معنوں کے ساتھ ان کی صورت بھی بدل دی اگرچہ اکثر ان میں سے عوام الناس بولتے ہیں مگر بعض الفاظ خواص کی زبانوں تک بھی پہونچ گئے مثلاً۔

ارداواہ۔ کہ اصل میں اردابہ تھا۔ **قبور**۔ قربوس۔

شروا۔ شوربہ یا شوراب۔ **پجاوہ**۔ پزاو۔ پزیدن سے۔

کھیسا۔ کیسہ۔ **ٹاٹ بافی**۔ تاربافی۔

کھگل۔ کاہ گل۔ **زری گوٹا**۔ زری کہنہ

ہمام دستہ۔ ہاون دستہ۔ **تار تلا**۔ طار طلا یعنی زری کہنہ۔

بجاز۔ بزاز۔ **تانے تشنے**۔ طعن و تشنیع۔

بک بک جھک جھک زق زق بق بق مردار سنگ۔ مردہ سنگ۔

توبہ تنسوہا۔ توبۂ نصوحا۔ **گدڑی۔ گدری**۔ بازار وقت شام

دسپنا دست پناہ ہیں کی فارسی ہے۔

سہ بندی۔ سپہ بندی۔ نگہداشت فوج۔

تاشہ۔ تاسہ اور تاسک فارسی لفظ ہے۔ **غوں فس**۔ غرش۔

افراتفری۔ یعنی افراط و تفریط۔ اصل میں نہایت بہتات اور نہایت کمی کے معنی میں اب کہتے ہیں عجب افراتفری پڑ رہی ہے یعنی ہل چل پڑ رہی ہے۔

قلانچ۔ قلاش یا قلاچ ترکی میں دونوں ہاتھوں کے درمیان کی وسعت کو کہتے ہیں اس لئے کپڑا ناپنے کا پیمانہ ہے یہاں خرگوش یا ہرن وغیرہ جانور دوڑتے ہیں تو کہیں گے کہ قلانچیں بھرتے ہیں × × ×

آکا۔ ترکی میں بڑے بھائی کو کہتے ہیں یہاں آکا یا دوست کو بولتے ہیں اور اُس میں کچھ بانکپن کو بھی دخل ہے

قیورق۔ ترکی میں شئے محفوظ کو کہتے ہیں یہاں جو شئے حاکم کی ضبطی میں آوے اُسے قرق کہتے ہیں۔

مشاطہ۔ مشط عربی میں کنگھی کو کہتے ہیں فارسی میں مشاطہ اس عورت کو کہتے ہیں جو عورتوں کو بناؤ سنگار کروائے جیسے ہندوستان میں ناین۔ اُردو میں مُشاطہ۔ بضم اوّل اور بتخفیف ثانی اُس عورت کو کہتے ہیں جو زن و مرد کی نسبت تلاش کرے اور شادی کروا دے۔

مُرغا۔ فارسی میں مُرغ فقط پرندہ ہے اُردو میں مُرغا

خروس مُرغی ماکیاں کو کہتے ہیں۔ ان کے ہاں ہر جمعہ کو مرغوں کی پالی بندھتی ہے۔

چخ یا چق ترکی میں باریک پردہ کو کہتے ہیں یہاں چلمن کو چک کہتے ہیں۔

کِتا ترکی میں بڑے کو کہتے ہیں یہاں کٹا موٹے کو کہتے ہیں ہٹا کٹا محاورہ ہے۔

نظر۔ بالتحریک ہے۔ مگر جمع اس کی بسکون اوسط ہی بولتے ہیں وزیر

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

خطّ۔ مُشدّد ہے مگر اب کہتے ہیں۔ آج کل خطوں میں آداب و القاب کا دستور ہی نہیں رہا۔ × × ×

عُمّر بھی عربی میں مشدّد ہے فارسی اور اُردو میں بالتخفیف بولتے ہیں۔

طرح عربی میں بالتسکین ہے اُردو کے اہلِ محاورہ اور شاعر بھی بالتحریک باندھتے ہیں۔

محلّ باتشدید ہے مگر کہتے ہیں کل بولی بھٹیاری کے

مخلوں بسنت ہے × × × ×

انگریزی زبان بھی اپنی عملداری بڑھاتی چلی آتی ہے ہندو مسلمان بھائیوں کو اُس دن کا انتظار چاہئے کہ وہ عربی فارسی کے لفظ جواب تک ہمارے تمھارے باپ دادا بولتے رہے آیندہ اُن کی جگہہ اس کثرت سے انگریزی لفظ نظر آئیں گے کہ عربی فارسی کے لفظ خود جگہ چھوڑکر بھاگ جائیں گے چند لفظ ایسے بھی دکھلانے چاہئیں جو کہ مختلف ممالک یورپ کے ہیں اور اب ہماری زبان میں اس طرح پیوند پا گئے ہیں کہ جوڑ تک نہیں معلوم ہوتا۔

کمرہ۔ اطالی ہے۔ پادری زبان لاطینی سے آیا ہے۔
نیلام۔ پرتگالی ہے وہ لیلام کہتے ہیں۔ لالٹین۔ لین ٹرن انگریزی ہے
اسٹام۔ سٹمپ۔ انگریزی ہے۔ بوتل۔ باٹل انگریزی ہے۔
بسکٹ۔ وبسکٹ۔ انگریزی ہے۔ درجن۔ ڈزن انگریزی ہے۔
پنشن۔ انگریزی ہے۔ بٹن۔ بٹن انگریزی ہے۔
بوتام۔ بوتان فرینچ ہے۔ بگی۔ انگریزی ہے۔
پستول۔ پسٹل انگریزی ہے۔ گلاس۔ انگریزی میں عام شیشہ ہے
فلانیں یا فلالین۔ فلنیل۔ انگریزی ہے۔ میم میڈم۔ انگریزی لفظ ہے

بابنٹ۔ بابی نٹ۔ ایک جالی کی قسم کا کپڑا۔ اردلی۔ آرڈرلی

اسی طرح اسٹیشن۔ ٹکٹ۔ ریل۔ پولس۔ وغیرہ صدہا لفظ ہیں کہ خاص و عام سے بڑھ کر عورتوں کی زبان تک پہونچ گئے ہیں اور جو الفاظ دفتروں اور کچہریوں میں صاحب لوگوں کے ملازم بولتے ہیں۔ اگر سب لکھے جائیں تو ایک ڈکشنری بنجائے۔

ہر زبان کے فصحا کا قاعدہ ہے کہ اپنی زبان میں تصرفات لطیف سے کچھ ایجاد کر کے نئے لفظ اور اصطلاحیں پیدا کرتے ہیں۔ ہماری اردو بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں رہی۔ ان اصطلاحوں کی بنیاد اگرچہ اتفاقی پڑتی ہے مگر اُن لوگوں کی طبیعت سے ہوتی ہے جو علم کے ساتھ فکر عالی۔ طبیعت براق۔ ذہن پُر ایجاد اور ایجاد دلپذیر رکھتے ہیں۔ اُن ہی کے کلام کو خاص و عام کے دلوں میں بھی اثر ہوتا ہے کہ اُن کی بات سب کے دلوں کو بھلی لگتی ہے اور اُسے اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً

گھوڑے کا رنگ جسے ہندوستان میں سرنگ اور پنجابی میں چنبا۔ یا لکّا کہتے ہیں فارسی میں اُسے کرنگ کہتے ہیں اور چونکہ بھاشا میں کُ علامت بدی اور سُ علامت خوبی ہے اس لئے اکبر نے اس کا نام سُرنگ رکھا۔ گھوڑے کی اندھیری کا نام۔

اُجیالی۔ رکھا کہ نیک شگون ہے۔

خاک روب کو حلال خور کا خطاب بھی اُسی ذرہ نواز بادشاہ کا بخشا ہوا ہے۔

جہانگیر کی رنگیلی طبیعت نے شراب کا نام رام رنگی رکھا اور اس کو فارسی کے شعرانے اشعار میں بھی باندھا طالب آملی ؎

نہ ایم منکر صہباو ایک میسگویم   کہ رام رنگیٔ ما نشۂ دگر دارد

سنگترہ کو اس کی خوبی و خوش رنگی کے سبب سے محمدؐ شاہ نے رنگترہ کہا۔

بُلبُل ہندوستان کا گُلدم نام رکھا۔

ہار کے لفظ کو بدشگون سمجھ کر پھلمال کہوایا۔

شاہ عالم نے سُرخاب کو بھی گلسرہ کہا مگر اس نے رواج نہ پایا۔

نواب سعادت علی خاں مرحوم نے ملائی کا نام بالائی رکھا کہ لکھنؤ میں عام اور دلّی وغیرہ میں کم رائج ہے۔ مذاق سلیم دونوں کے لطف میں امتیاز کرسکتا ہے۔

بھاشا کی ساخت کو دیکھو کہ ہر ایک زبان کے ملاپ کے لئے ملنسار طبیعت رکھتی ہے نظم و نثر پر غور سے نظر کرو اُس نے اپنے

مہمان کے لئے فقط لفظوں ہی میں جگہہ خالی نہیں کی بلکہ بہت سے
الفاظ و خیالات جو کہ ملکی خصوصیت عربی فارسی سے رکھتے تھے وہ بھی
لے لئے۔ چنانچہ بہادری کا میدان رستم و سام کو دیا حالانکہ یہاں وہ
بھیم اور ارجن کا حق تھا سودا کہتے ہیں ؎

رستم رہا زمین پہ نہ سام رہ گیا مردوں کا آسماں کے تلے نام رہگیا
رستم سے بھلا کہ تو سر تیغ تلے دھردے پیارے یہ ہمیں سے ہو ہر کارو ہر مردے

حُسن و جمال کے شبستان میں لیلی و شیریں آگئیں اور جب وہ آئیں
تو انجھے کی جگہہ مجنون و فرہاد کیونکر نہ آتے مجنون و فرہاد کی آنکھوں
سے گنگا و جمنا تو بہہ نہیں سکیں مجبوریوں۔ یوں ہندوستان میں آ گئے
ہمانچل اور بند ھیاچل کو چھوڑ کر کوہ بیستوں قصر شیریں کوہ الوند سے
سر پھوڑتے ہیں مگر جب کوئی خوش طبع چاہتا ہے تو یہیں کے پھولوں
سے بھی یہاں کے مکان سجا دیتا ہے اور وہ عجب بہار دیتے ہیں۔

ایک زبان کے محاورہ کو دوسری زبان میں ترجمہ کرنا جائز
نہیں مگر ان دونوں زبانوں میں ایسا اتحاد ہو گیا کہ یہ فرق بھی
اُٹھ گیا اور اپنے کار آمد خیالوں کے ادا کرنے کے لئے دلپذیر اور
دلکش اور پسندیدہ محاورات جو فارسی میں دیکھے انھیں کبھی بجنسہ
اور کبھی ترجمہ کر کے لیا مثلاً بر آمدن اور بسر آمدن ہندی میں

اِس کا ترجمہ لفظی ڈھونڈیں تو نہیں ہے۔ مگر اہلِ زبان نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ تضمین کر لیا اور سودا نے کہا۔ سودا۔

اِس دل کی تفِ آہ سے کب شعلہ بر آئے بجلی کو دم سرد سے جس کے حذر آئے
افعی کو یہ طاقت ہو کہ اُس سے بسر آئے وہ زلف سیہ اپنی اگر لہر پہ آئے

در آمدن۔ یعنی گھس آنا۔ سودا

یہاں تک نہ دل آزار خلائق ہو کوئی مل کر لہو مُنہ سے صفِ محشر میں در آئے

عرق عرق شدن اور آب شدن **ذوق**

آگ دوزخ کی بھی ہو جائے گی پانی پانی جب یہ عاصی عرق شرم سے تر جائیں گے

حرف آیدن اور **دل خوں شدن**

حرف آئے مجھ پہ دیکھئے کس کس نام سے اس درد سے عقیق کا دل خوں ہے مین ہے

سید انشا۔ ع۔ لب وہ کہ لعل کے بھی نگینہ پہ حرف ہے ؎

چشمک زدن۔ **ذوق**

لب پر ترے پسینہ کی بوندا ی عقیق لب چشمک زنی کرے ہے سہیلِ یمن کے ساتھ

پیمانہ پُر کردن۔ مار ڈالنا۔ سودا

ساقی چمن میں چھوڑ کے مجکو کدھر چلا پیمانہ میری عمر کا ظالم تو بھر چلا

دامن افشاندہ برخاستن۔ بیزار ہو کر اُٹھ کھڑے ہونا۔ سودا

کیا اس چمن میں آن کے لیجائیگا کوئی دامن تو میرے سامنے گل جھاڑ کر چلا

از جامہ بیرون شدن

نکلا پڑے ہی جامے سے کچھ اندنوں رقیب　　تھوڑے ہی دم دلاسے میں اتنا ابھر چلا

کب صبا آئی ترے کوچہ سے اے یار کہیں　　جوں حباب لب جو جامہ سے باہر نہ ہوا

اگرچہ اِن باتوں پر فصاحت کے اصول عامہ کے بموجب بہت اعتراض ہوئے مگر احتراز نہ ہوئے کیونکہ بولنے والوں کی نسلیں اور اصلیں اور گھر اور گھرانے فارسی سے شیر و شکر ہو رہے تھے۔ جتنا اِسکا دخل زیادہ ہوتا تھا اتنا ہی مزہ زیادہ ہوتا تھا۔ اور آج دیکھتے ہیں تو اور ہی رنگ ہے۔ ہمارے قادر الکلام انشا پرداز ترجمے کر کے انگریزی کے خیالوں کے چربے اُتارتے ہیں اور ایسا ہی چاہئے۔ جہاں اچھا پھول دیکھا چُن لیا اور دستار نہیں تو کوٹ میں زیب گریبان کر لیا ہمارے انشا پردازوں نے جب دیکھا کہ فارسی والوں نے اپنی قادر سخنی کے زور یا ظرافت طبع کے شور سے عربی ترکیبوں کا استعمال کیا ہے تو اُنھوں نے بھی اپنے پیارے ملک کی زبان کو اس نمک سے بے لطف نہ چھوڑا۔ سودا فرماتے ہیں۔ ع

جیسی کہتا ہے کوئی ہو ترا صفا صفا

سید رضی خاں رضی مرحوم نے کیا خوب کہا۔

ع۔ تری وہ مثل ہے کہ اے رضی نہ اِنّے الذی نہ اُنّے الذی ؛

دونوں زبانوں کے باب تشبیہات میں ایک نکتہ کہے بغیر مجھ سے
آگے بڑھا نہیں جاتا۔ یعنی مختلف افراد انسان کے طبائع پر غور کرو
کہ ہزاروں کوس پر پڑے ہوں اور مختلف طبیعت کے ملکوں میں
ہوں لیکن چونکہ طبیعت انسانی متحد ہے۔ اس لئے دیکھو ان کے
خیالات کس قدر ملتے جلتے ہوتے ہیں چنانچہ یہاں بالوں کی
تعریف میں ناگوں کے لہرانے اور بھونروں کے اُڑنے سے تشبیہ
دیتے ہیں فارسی میں بھی زلف کی تشبیہ سانپ کے ساتھ آئی
ہے اس لئے اُردو میں سانپ رہے اور بھونرے اُڑ گئے اور
اس کی جگہ مُشک ۔ بنفشہ ۔ سنبل ۔ ریحان آ گئے جو کبھی یہاں
دیکھے بھی نہیں مگر عرب کا سادہ مزاج فصیح اپنے نیچر کا حق ادا کرتا
ہے اور زلف کو کوئلے سے تشبیہ دیتا ہے۔ سانولی رنگت کی تعریف
میں شام برن اور میگھ برن کہتے تھے۔ اُس سے کُھلتا رنگ
ہوتا تو چنپک برنی کہتے تھے۔ اب سمن رنگ اور سیم رنگ
الفاظ حُسن کو بہار دیتے ہیں مگر چندر مکھ اور ماہ رخ مشترک ہے۔
آنکھ کی تعریف میں یہاں مرگ کی آنکھ اور کنول کے پھول
اور ممولا کی اچپلاہٹ سے تشبیہ دیتے تھے۔ اُردو میں آہو چشم
ہے مگر ممولے ہوا ہو گئے اور کنول کی جگہ ساغر لبریز اور نرگس شہلا

آگئے جو کسی نے یہاں دیکھی بھی نہ تھی بلکہ ترک چشم۔ شمشیر نگاہ سے قتل کرنے لگے۔

رفتار کے لئے بھاشا میں ہتنی اور ہنس کی چال ضرب المثل ہے اب ہنس کے ساتھ ہاتھی بھی اُڑ گیا فقط کبک دری۔ شورِ محشر اور فتنۂ قیامت نے آفت برپا کر رکھی ہے۔ بھاشا میں ناک کی تشبیہ طوطہ کی ناک سے تھی۔ اب زنبق کی کلی سے تشبیہ دیتے ہیں ہیں آتش کا شعر ہے۔

توڑنے والے گل زنبق کے ہیں کاٹنے والے چمن کی ناک کے

فارسی والوں نے کمر کی نزاکت میں بڑی باریکیاں نکالی ہیں مگر سنسکرت نے بھی اپنی جگہہ مبالغہ میں کچھ کمی نہیں کی چنانچہ آنکھوں کی تعریف میں ایک شاعر نے کہا۔ گوشے اُن کے کانوں سے جا ملے تھے۔

پہلے یہاں ہوا یا ابر یا ہنس کو قاصد کہتے تھے۔ اُنھوں نے نسیم اور صبا کو قاصد رکھا بلکہ نالہ اور آہ اور اشک سے بھی پیغام رسانی کا کام لیا۔ اُستاد مرحوم کا شعر ہے۔

نالہ ہے اُن سے بیان درد جدائی کرتا کام قاصد کا ہے یہ تیر ہوائی کرتا

ظفر گر نہیں ہے کوئی نامہ بر ظفر تم آنسو ہی اپنا روانہ کرد

سودا

قاصد اشک آ کے خبر کر گیا　　قتل کوئی دل کا نگر کر گیا

فارسی والے طفل اشک باندھتے تھے۔ اُنھوں نے بھی اُسے لڑکا بنایا۔ اور دیکھو اُستاد مرحوم نے اس کے لئے دامن کیا خوب تیار کیا ہے۔ ع

طفل اشک ایسا گرا دامانِ مژگاں چھوڑ کر

اور ظفر نے کہا ع۔ کیا ہی شریر لڑکے یہ اوپر تلے کے ہیں؛

اور معروف نے بھی کہا ہے ؎

ابھی سے نام خدا کر نے قاصدی نکلا　　یہ طفل اشک بڑا پانو کا بلی نکلا

بیاں کیا کروں اشک کی ابتری کا　　یہ لڑکا بد اطوار پیدا ہوا ہے

یہ نہ سمجھنا کہ فارسی زبان ہندی میں تصرف حاکمانہ کرتی رہی۔ نہیں۔ اُسے بھی یہاں کے الفاظ لئے بغیر چارہ نہیں ہوا۔ چنانچہ جو الفاظ فارسی اور سنسکرت کی اصلیت میں متفق ہیں اُن سے قطع نظر کر کے کہتا ہوں کہ سلاطین چغتایہ کے دفتروں میں صدہا لفظ ہندی کے تھے۔ جو کہ فارسی عبارتوں میں بے تکلف مستعمل ہوتے تھے اور اب بھی عہد مذکور کی تواریخوں میں موجود ہیں مثلاً جھروکہ درشن اور پھول کٹارہ اور پھپوہ مرصع۔

جہانگیر بادشاہ اپنی توزک میں لکھتا ہے کہ میرا بھائی شاہ مُراد کوہستان فتحپور سیکری میں پیدا ہوا تھا۔ اسی واسطے میرے والد اُسے پہاڑی راجہ کہا کرتے تھے اور آرام بانو بیگم میری چھوٹی بہن کو بہت پیار کرتے تھے۔ اور اکثر مجھ سے کہتے تھے کہ بابا بجہت خاطر من بایں خواہر خود کہ لاڈلہ من است بعد از من باید بردشے سلوک کنی کہ من بہ او میکنم۔ نازو بر داشتہ بےادبی و شوخی ہاے اوراںگذرانی۔ اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں بچپن میں اکبر کو شاہ بابا اور جہانگیر کو شاہ بھائی کہا کرتا تھا۔

اسی طرح شعرانے اپنے تصرفات رنگین کے ساتھ اشعار فارسی کو رونق دی ہے۔ امیر خسرو چھ سو برس پہلے کہتے ہیں ع بنشستہ چوں درپالکی نہ چرخ کہار آمدہ اور دہلی کی یاد میں ایک جگہہ کہتے ہیں۔

اے دہلی والے بتان سادہ پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ

اور سہ نثر میں بادشاہ کے لئے کیا خوب کہا ہے۔ بار جگت گردی عالم بر خود گرفتہ۔ بیان مذکورہ بالا سے اجمالاً معلوم ہوگیا کہ اُردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی زمین میں اُگا مگر فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا ہے۔ البتہ مشکل یہ ہوئی کہ بیدل اور ناصر علی کا زمانہ قریب گذر چکا تھا اور اُن کے معتقد باقی تھے وہ استعارہ اور تشبیہ کے لطف سے مست تھے۔ اسواسطے اُردو بھاشا میں استعارہ و تشبیہ کا رنگ بھی آیا اور بہت تیزی سے آیا۔ یہ رنگ اگر اسی قدر

آتا کہ جتنا چہرہ پر اُبٹنے کا رنگ یا آنکھوں میں سرمہ تو خوشنمائی اور بینائی دونوں کو مفید تھا مگر افسوس کہ اس کی شدت نے ہمارے قوت بیان کی آنکھوں کو سخت نقصان پہونچایا اور زبان کو خیالی باتوں سے فقط توہمات کا سوانگ بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھاشا اور اُردو میں زمین و آسمان کا فرق ہوگیا۔ چاہتا ہوں کہ دونوں کے نمونے آمنے سامنے رکھ کر اُن کے فرق دکھاؤں مگر اُس سے پہلے دو تین باتیں خیال میں رکھنی چاہئے۔ اوّل تو شاعرانہ اُردو کا نوجوان جس نے فارسی کے دودھ سے پرورش پائی۔ اِس کی طبیعت میں بہت سے بلند خیالات اور مبالغہ مضامین کے ساتھ وہ حالات اور ملکی رسمیں اور تاریخی اشارے آگئے جو فارس اور ترکستان سے خاص تعلق رکھتے تھے اور بھاشا کے طبعی مخالف تھے۔ ساتھ اس کے فارسی کی نزاکت اور لطافت طبعی کے سبب سے اُردو کے خیالات اکثر ایسے پیچیدہ ہو گئے کہ بچپن سے ہمارے کانوں میں پڑتے اور ذہنوں میں جمتے چلے آتے ہیں اس لئے ہمیں مشکل نہیں معلوم ہوتے۔ اَن پڑھ انجان۔ یا غیر زبان والا انسان سنتا ہے تو مُنہ دیکھتا رہ جاتا ہے کہ یہ کیا کہا۔ اس لئے اُردو پڑھنے والے کو واجب ہے کہ فارسی کی انشا پردازی سے ضرور آگہی رکھتا ہو۔ فارسی اور اُردو کی انشا پردازی میں جو دشواری ہے اور ہندی کی انشا میں آسانی ہے۔ اس میں ایک باریک نکتہ غور کے لایق ہے وہ یہ

ہے کہ بھاشا زبان جس شے کا بیان کرتی ہے اس کی کیفیت ہمیں اُن خط و خال
سے سمجھاتی ہے جو خاص اُسی شے کے دیکھنے۔ سونگھنے چکھنے یا چھونے
سے حاصل ہوتی ہے۔ اس بیان میں اگرچہ مبالغہ کے زور یا جوش و خروش
کی دھوم دھام نہیں ہوتی مگر سننے والے کو جو اصل شے کے دیکھنے سے مزہ آتا
وہ سننے سے آجاتا ہے۔ برخلاف شعراء فارس کے کہ یہ جس شے کا ذکر کرتے
ہیں صاف اُس کی برائی بھلائی نہیں دکھادیتے بلکہ اُس کے مشابہ
ایک اور شے جسے ہم نے اپنی جگہہ اچھا یا بُرا سمجھا ہوا ہے اُس کے لوازمات
کو شے اوّل پر لگا کر اُن کا بیان کرتے ہیں مثلاً پھول کہ نزاکت رنگ اور
خوشبو میں معشوق سے مشابہ ہے۔ جب گرمی کی شدت میں معشوق کے حُسن
کا اندازہ دکھانا ہو تو کہیں گے کہ مارے گرمی کے پھول کے رُخساروں
سے شبنم کا پسینہ ٹپکنے لگا اور اسی رنگ میں شاعر کہتا ہے **خواجہ وزیر۔ وزیر**

ہوں وہ بُلبُل جو کرے ذبح خفا تو ہوکر روح میری گُلِ عارض میں رہے بو ہوکر

یہ تشبیہیں اور استعارے اگر پاس کے ہوں اور آنکھوں کے سامنے
ہوں تو کلام میں نہایت لطافت اور نزاکت پیدا ہوتی ہے لیکن جب
دور جا پڑیں اور بہت باریک پڑ جائیں تو دقّت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہمارے
نازک خیال کسی بادشاہ کے اقبال اور عقل کے لئے اس قدر تعریف پر قناعت
نہیں کرتے کہ وہ اقبال میں سکندر یونانی اور عقل میں ارسطوئے ثانی ہے

بلکہ بجائے اس کے کہتے ہیں کہ اگر اُس کا ہمائے عقل۔ اوج اقبال سے سایہ ڈالے۔ تو ہر شخص کشور دانش دولت کا سکندر اور ارسطو ہو جائے۔ بلکہ اگر اس کے سینہ میں دلائل عقلی کا دریا جوش مارے تو طبقہ یونان کو غرق کر دے۔ اوّل تو ہُما کی یہ صفت خود ایک بے بنیاد فرض ہے اور وہ بھی اُسی مُلک کے ساتھ خاص ہے۔ اُس پر ایک اقبال کا فلک الافلا تیّار کرنا اور اُس پر نقطۂ اوج کا دریافت کر لو دیکھئے۔ وہاں اُن کے فرضی ہما کا جانا دیکھئے پھر زمین پر اُس خیالی آسمان کے نیچے ایک تدبیر کا یونان بسانا دیکھئے۔ پھر اس فرضی ہما کی برکت کا اس قدر عام کرنا دیکھئے جس سے دُنیا کے جاہل اس خیالی یونان میں جا کر ارسطو ہو جائیں۔ دوسرے فقرے میں اوّل علماء ہند نے تنور سے طوفان کا نکلنا مانا ہی نہیں ہے اُس پر طبقہ یونان کا اپنے فلسفہ کی تہمت میں تباہ ہونا وغیرہ وغیرہ ایسی باتیں اور روایات ہیں کہ اگرچہ ہمارے معمولی خیالات ہوں مگر غیر قوم بلکہ ہمارے بھی عام لوگ اُس سے بے خبر ہیں۔ اس لئے بے سمجھائے نہ سمجھیں گے۔ اور جب بات کو زبان سے کہہ کر سمجھانے کی نوبت آئی تو لطف زبان کجا! اور یہ نہیں تو تاثیر کجا! مزہ وہی ہے کہ آدھی بات کہی آدھی منہ میں ہے اور سننے والا پھڑک اُٹھا۔ تار باجا اور راگ بوجھا۔ خیالی رنگینیوں اور فرضی لطافتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو باتیں بدیہی ہیں اور یہ

محسوسات میں عیاں ہیں۔ ہماری تشبیہوں اور استعاروں کے پیچ در پیچ خیالوں میں آکر وہ بھی عالم تصور میں جا پڑتی ہیں۔ کیونکہ خیالات کے ادا کرنے میں ہم اوّل اشیاءِ بے جان کو جاندار بلکہ اکثر انسان فرض کرتے ہیں بعد اس کے جانداروں اور عاقلوں کے لئے جو باتیں مناسب حال ہیں ان بیچاروں پر لگا کر ایسے ایسے خیالات پیدا کرتے ہیں جو اکثر ملک عرب یا فارس یا ترکستان کے ساتھ قومی یا مذہبی خصوصیت رکھتی ہیں۔ مثلاً رات کو اہلِ محبت کے جلسہ میں اوّل تو ساقی کا آنا واجب ہے۔ اُس کی پیشانی اور رخسارہ سے نورِ صبح روشن ہے مگر زُلف کی شام بھی برابر مُشک افشاں ہے۔ صراحی کبھی سرکشی کرتی ہے اسی لئے جگر خون ہو کر ٹپکتا ہے۔ کبھی جُھکتی ہے اور خندۂ قلقل سے ہنستی ہے۔ کبھی وہی قلقل حق حق ہو کر یادِ الٰہی میں صرف ہوتی ہے۔ مگر پیالہ اپنے کُھلے مُنہ سے ہنستا ہے اور اُس کے آگے دامن بھی پھیلاتا ہے۔ فلک تیرِ حوادث کا ترکش اور کمانِ کہکشا لگائے کھڑا ہے مگر عاشق کا تیرِ آہ اُس کے سینہ کے پار جاتا ہے۔ پھر بھی زحل منحوس کی آنکھ نہیں پھوٹتی کہ عاشق کی صبحِ مراد روشن ہو۔

یہاں کی محفل میں شمع برقعِ فانوس میں تاجِ زر سر پہ رکھے کھڑی ہے اس لئے پروانہ کا آنا بھی واجب ہے۔ وہ عاشق زار آتے ہی جل کر خاک ہو جاتا ہے۔ چراغ کو ہنساتے ہیں اور شمع کو عاشق

کے غم میں رُلاتے ہیں۔ وہ باوفا عشق کی تپ میں سراپا جلتی ہے اُس کی چربی گُھل گُھل کر بہتی ہے۔ مگر پائے استقامت اس کا نہیں ٹلتا۔ یہاں تک کہ سفیدہ سحری کبھی آکر کافور دیتا ہے اور کبھی طباشیر۔ شمع کا دل اس لئے گداز ہے کہ شب زندگی کا دامن بہت چھوٹا ہے۔ لیکن صبح دونوں کے ماتم میں گریباں چاک کرتی ہے۔ عاشق بادہ خوار کے لئے مُرغ سحر پڑا موذی ہے۔ اُس کے ذبح کو ہمیشہ تیغ زباں تیز رہتی ہے۔ بادسحر قاصد خجستہ گام ہے کہ پیغام یار کا بہت جلد لاتا اور لے جاتا ہے۔ اسی عالم میں آفتاب کبھی تو پنجۂ شعاع سے آنکھ ملتا ہے سر برہنہ مشرق سے نکلتا ہے کبھی فلک کے سبزہ گھوڑے پر سوار کرن کا تاج زرنگار سر پر چمکاتا شفق کا پھریرا اُڑاتا آتا ہے کیونکہ اپنے حریف شاہ انجم کی فوج کو پریشان کرکے فتحیاب آیا ہے۔ انھیں بنیادوں پر جب گلزار کی شگفتگی یا باغ کی بہار دکھائی ہو تو ایسے خیالات میں دکھائیں گے کہ شاہد گل کے کان میں قاصد صبا کچھ ایسا افسوں پھونک گیا کہ وہ مارے ہنسی کے فرش سبزہ پر لوٹ گیا۔ طفل غنچہ مسکرا کر اپنے عاشق بلبل شیدا کا دل لبھاتا ہے۔ کبھی خزاں کا غارت گر آتا ہے تو گُل اپنا جام اور غنچہ اپنی صراحی لے کر روانہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے باغ میں بہار خود ایک معشوق ہے۔ اُس کا چہرہ چمن ہے۔ گُل رخسار ہیں۔

سنبل بال ہیں بنفشہ زلف ہیں نرگس آنکھیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔

پھر بہار موسم جوانی ہے۔ درخت جوانان چمن ہیں کہ عروسان گلشن سے گلے مل مل کر خوش ہوتے ہیں شاخیں انگڑائیاں لیتی ہیں ناک کا سیہ مست پڑا اینڈتا ہے۔ اطفال نبات دایۂ بہار کی گود میں پرورش پاتے ہیں خضر سبزہ کی برکت سے نسیم سحری مردہ ہزار سالہ میں دم عیسوی کا کام دیتی ہے مگر بلبل زار عشق شاہدِ گل میں اُداس ہے آبِ رواں عمر گذران ہے اُس کی موج کی تلوار سے دل کٹے جاتے ہیں سرو کے عکس کا اژدہا نگلے جاتا ہے۔ شبنم کے آنسو جاری ہیں بُلبُل کبھی خوش ہے کہ گل اُس کا پیارا پاس ہنس رہا ہے۔ کبھی افسردہ کہ خزاں کا خونریز اُن سب کو قتل کرے گا۔ یا اُس کے دشمن یعنی گلچیں وصیاد اُسے وہاں سے نکالیں گے۔ سرو یا شمشاد کے عشق میں قمری کا گیرواالباس ہے اُس کے نالہ کا آرا دلوں کو چیرتا ہے کبھی عاشق زار بھی وہیں آنکلتا ہے۔ وہ بجائے اپنے معشوق کے حسرت وغم سے ہم کنار ہے۔ روتا ہے اور قاصد صبا کو پیغام دیتا ہے کہ میرے تغافل شعار کو ذرا میرے حال کی خبر کر دینا۔

بیان مذکورہ بالا سے معلوم ہوا ہوگا کہ ان میں بہت سی باتیں

ایسی ہیں جو خاص فارس اور ترکستان کے ملکوں سے طبعی اور ذاتی تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ بعض خیالات ہیں اکثر اُن داستانوں یا قصّوں کے اشارے بھی آگئے ہیں جو خاص ملک فارس سے علاقہ رکھتے تھے۔ مثلاً شمشاد۔ نرگس۔ سنبل۔ بنفشہ۔ موے کمر۔ قدسرو وغیرہ کی تشبیہیں۔ لیلی۔ شیریں۔ شمع گل۔ سرو وغیرہ کا حُسن۔ مجنون۔ فرہاد۔ بُلبُل۔ قمری۔ پروانہ کا عشق۔ فانوس کا برقع۔ غازہ اور گلگونہ۔ مانی و بہزاد کی مصوّری رستم و اسفندیار کی بہادری۔ زحل کی نحوست۔ سہیل یمن کی رنگ افشانی۔ مشاہیر فارس و یونان اور عرب کے قصّے راہ ہفتخواں۔ کوہ الوند۔ کوہ بے ستون۔ جوے شیر۔ قصر شیریں۔ جیحون۔ سیحون۔ وغیرہ وغیرہ ہرچند سب معاملات عرب اور فارس سے متعلق ہیں۔ مگر اُردو میں بہت سے خیالات انھیں کی بنیاد پر نظم و نثر میں پیدا ہوتے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ ان خیالات نے اور وہاں کی تشبیہوں نے اس قدر زور پکڑا کہ اُن کے مشابہ جو یہاں کی باتیں تھیں انھیں بالکل مٹا دیا البتہ سودا۔ سید انشا کے کلام میں کہیں کہیں اور وہ اپنے موقع پر نہایت لطف دیتے ہیں۔ غرض کہ اب انشا پردازی ایک پرانی یادداشت اُن تشبیہوں اور استعاروں کی ہے کہ صدہا سال سے ہمارے بزرگوں کی دست مال ہوکر ہم تک میراث پہونچی ہے۔ ہمارے متاخرین کو نئی آفریں لینے کی آرزو ہوئی تو بڑا کمال

یہ ہے کہ کبھی صفت بعد صفت کبھی استعارہ در استعارہ سے اُسے اور تنگ و تاریک کیا جس سے ہوا تو یہ ہوا کہ بہت غور کے بعد فقط ایک وہمی نزاکت اور فرضی لطافت پیدا ہو گئی کہ جسے محالات کا مجموعہ کہنا چاہئے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ بجائے اُس کے کہ کلام اُن کا خاص و عام کے دلوں پر تاثیر کرے۔ وہ مستعد لوگوں کی طبع آزمائی کے لئے ایک دقیق معمّے اور عوام کے لئے ایک عجیب گورکھ دھندا تیار ہو گیا اور جواب اُن کا یہ ہے کہ کوئی سمجھے تو سمجھے جو نہ سمجھیں وہ اپنی جہالت کے حوالے۔

اب اس کے مقابلہ میں دیکھو بھاشا کا انشا پرداز برسات میں اپنا باغ کیونکر لگاتا ہے۔ درختوں کے جھنڈ چھائے ہیں۔ گھن کے پتے ہیں۔ اُنکی گھری گھری چھاؤں ہے۔ جامن کی ٹہنیاں آم کے پتوں میں کھچڑی ہو رہی ہیں۔ کھرنی کی ٹہنیاں فالسے کے درخت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ چاندنی کی بیل کمرک کے درخت پر لپٹی جاتی ہے۔ عشق پیچہ۔ گکرونده پر چڑھا جاتا ہے۔ اُس کی ٹہنیاں لٹکتی ہیں جیسے سانپ لہرا رہے ہیں۔ پھولوں کے گچھے پڑے جھوم رہے ہیں۔ میوے والے زمین کو چوم رہے ہیں۔ نیم کے پتوں کی سبزی اور پھولوں کی سفیدی بہار پر ہے۔ آم کے بور میں اُس کے پھولوں کی مہک آتی ہے۔ بھینی بھینی بُو جی کو بھاتی ہے۔ جب درختوں کی ٹہنیاں ہلتی ہیں۔ مولسری کے پھولوں کا مینہ

برستا ہے۔ پھل پھلاری بوچھار ہو جاتی ہے۔ دھیمی دھیمی ہوا اُن کی بوباس
مین بسی ہوئی روشوں پر چلتی ہے۔ ٹہنیاں ایسی ہلتی ہیں جیسے کوئی جوبن
کی متوالی اٹھکیلیاں کرتی چلی جاتی ہے۔ کسی ٹہنی میں بھونرے کی آواز۔
کسی میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ، الگ ہی سماں باندھ رہی ہے۔ پرندے درختوں
پر بول رہے ہیں اور کلول کر رہے ہیں۔ حوض میں چادر اس زور سے
گرتی ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اُس سے چھوٹی چھوٹی نالیوں
میں پانی لہراتا جاتا ہے تو عجب بہار دیتا ہے۔ درختوں سے جانور اُترتے
ہیں نہاتے جاتے ہیں۔ آپس میں لڑتے جاتے ہیں پروں کو پھڑاتے
ہیں اور اُڑ جاتے ہیں۔ چرند زمین پر چوکڑیاں بھرتے پھرتے ہیں ایک
طرف سے کوئل کی کوک ایک طرف سے کوکلے کی آواز۔ اِسی جمگھٹ
میں عاشق مصیبت زدہ بھی کہیں اکیلا بیٹھا جی بہلا رہا ہے اور اپنی جدائی
کے دکھ کو مزے لے لے کر اُٹھاتا ہے۔

برسات کا سماں باندھتے ہیں۔ تو کہتے ہیں سامنے سے کالی
گھٹا جھوم کر اُٹھی۔ ابر دھواں دھار ہے۔ بجلی کوندتی چلی آتی
ہے۔ سیاہی میں سارس اور بگلوں کی سفید سفید قطاریں بہار
دکھا رہی ہیں۔ جب بادل کڑکتا ہے اور بجلی چمکتی ہے تو پرندے
کبھی دبک کر ٹہنیوں میں چھپ جاتے ہیں۔ کبھی دیواروں سے لگ جاتے

ہیں۔ مور جدا جھنگارتے ہیں۔ پپیہے الگ پکارتے ہیں۔ محبت کا متوالا چمپلی
کے جھرمٹ میں آتا ہے تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لہک کر پھوار بھی پڑنے لگی
ہے۔ مست ہو کر وہیں بیٹھ جاتا ہے اور شعر پڑھنے لگتا ہے۔

جب ایک شہر کی خوبی بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں شام ہوتے ایک
مقام پر پہونچا دیکھتا ہے کہ پہاڑیاں ہری بھری ہیں ار دگرد سرسبز میدانوں
میں بسے ہوئے گانوں آباد ہیں۔ پہاڑ کے نیچے ایک دریا میں نرمل جل بہ
رہا ہے۔ جیسے موتی کی آب بیچوں بیچ میں شہر آباد۔ جب اُس کے اونچے
اونچے مکانوں اور برجوں کا عکس پڑتا ہے تو پانی میں کلسیاں جگمگ جگمگ
کرتی ہیں اور دوسرا شہر آباد نظر آتا ہے۔ لبِ دریا کے پیڑ بوٹوں اور
زمین کے سبزے کو برسات نے ہرا کیا ہے کہ دودھیلیں گائیوں اور بکریوں
کا چارہ ہو جائے۔

جب اُداسی اور پریشانی کا عالم دکھاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آدھی رات
ادھر۔ آدھی رات اُدھر۔ جنگل سنسان۔ اندھیرا بیابان۔ مرگھٹ میں دُور
دور تک راکھ کے ڈھیر۔ جلے ہوئے لکڑ پڑے۔ کہیں کہیں چتا میں آگ چمکتی
ہے بھوتوں پریتوں کی ڈراؤنی صورتیں اور بھیانک مورتیں ہیں۔ کوئی
تاڑ سا قد۔ لال لال دیدے پھاڑے لمبے لمبے دانت نکلے گلے میں
کھوپڑیوں کا مالا ڈالے کھڑا ہنس رہا ہے۔ کوئی ایک ہاتھی کو مارے بغل

میں سے بھاگا جاتا ہے۔ کوئی ایک کالا ناگ لکڑی کی طرح کھڑا چبا رہا ہے
پیچھے غل ہوتا چلا آتا ہے کہ بچیو بچیو۔ مار یو۔ مار یو۔ جانے نہ پائے۔ دم بھر میں
یہ بھوت پریت غایب ہوتے ہیں۔ غل شور تھمتا ہے۔ پھر مرگھٹ کا
میدان سنسان ہے۔ پتّے ہوا سے کھڑکتے ہیں۔ ہوا کا سنّاٹا۔ پانی
کا شور۔ اُلو کی ہوک۔ گیدڑوں کا بولنا اور کتّوں کا رونا یہ ایسی وحشت
ہے کہ پہلے ڈر بھی بھول جاتے ہیں۔

دیکھو یہ دونوں باغ آمنے سامنے لگے ہیں تم نے مقابلہ کیا؟ دونوں
کے رنگ ڈھنگ میں کیا فرق ہے۔ بھاشا کا فصیح استعارہ کی طرف
بھول کر بھی قدم نہیں رکھتا۔ جو جو لطف آنکھوں سے دیکھتا ہے اور جن
خوش آوازیوں کو سُنتا ہے یا جن خوشبویوں کو سونگھتا ہے اُنھیں کو
اپنی میٹھی زبان سے بے تکلف۔ بے مبالغہ صاف صاف کہہ دیتا ہے۔

لیکن یہ نہ سمجھنا کہ ہندوستان میں مبالغہ کا زور تھا ہی نہیں۔
سنسکرت کا انشا پرداز ذرا اگڑ جائے تو زمین کے ماتھے پر پہاڑ تیوری
کے بل ہو جائیں اور وہاں غار پتھروں سے دانت پیسنے لگیں۔ ان
مضامین کو دیکھ کر اوّل ہمیں وہ عام قاعدہ یاد آتا ہے کہ ہر ملک کی انشا پردازی
اپنے جغرافیے اور سرزمین کی صورت حال کی تصویر بلکہ رسم و رواج اور لوگوں
کی طبیعتوں کا آئینہ ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جو کچھ شاعر یا انشا پرداز کے

پیش نظر ہوتا ہے اُسکی تشبیہوں اور استعاروں کا سامان ہوتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ایران خراسان اور توران کی زمین میں بہار کا موسم دلوں کو شگفتہ کرتا ہے۔ یہاں برسات کا موسم دلوں میں ذوق و شوق پیدا کرتا ہے وہاں بہار میں بُلبُل ہزار داستاں ہے۔ یہاں کوئل اور پپیہا ہے۔ برج بھاشا کے انشا پرداز برسات کے لطف اور اُسکی کیفیتیں بہت خوب دکھاتے ہیں۔ جہانگیر نے اپنے توزک میں سچ کہا ہے کہ ہندوستان کی برسات۔ ہماری فصل بہار ہے اور کوئل یہاں کی بُلبُل ہے اُس موسم میں عجب لطف سے بولتی ہے اور مستیاں کرتی ہے۔ بہار کے موسم کا کچھ لُطف یہاں ہے تو بسنت رت کا سماں ہے۔ جس میں ہولی کے رنگ اُڑتے ہیں۔ پچکاریاں چھوٹتی ہیں۔ گلال کے قمقمے چلتے ہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جو فارس والے بہار کے سمے پر کرتے ہیں۔

بہر حال ہمیں اپنے بزرگوں کی اس صنعت کا شکریہ ہی کرنا چاہئے کہ ہندی بھاشا میں جو اضافت کی طوالت۔ کا۔ کے۔ کی۔ سے ادا ہوتی ہے وہ فارسی کی اضافت میں آکر مختصر ہوگئی۔ اس کے علاوہ استعارہ و تشبیہہ جو بھاشا میں شاید اس سبب سے کم لاتے تھے کہ وہ کتاب یا انشا پردازی کی زبان نہ تھی۔ یا اس سبب سے کہ برابر کا اور کے۔ کے

آنے سے کلام بدمزہ ہو جاتا تھا۔ اسی طرح بہت تشبیہہ میں بھی لفظوں کے بڑھاوے سے کلام مرتبۂ فصاحت سے گر جاتا تھا۔ اب اُنھوں نے فارسی کو اس میں داخل کر کے استعارہ و تشبیہہ سے مرصع کردیا جس سے وہ خیالوں کی نزاکت اور ترکیب کی پختگی اور زور کلام اور تیزی و طراری میں بھاشا سے آگے بڑھ گئی اور بہت سے نئے الفاظ اور نئی ترکیبوں نے زبان میں وسعت بھی پیدا کی۔

اس فخر کے ساتھ یہ افسوس پھر بھی دل سے نہیں بھولتا کہ اُنھوں نے ایک قدرتی پھول کو جو اپنی مہک سے مہکتا اور رنگ سے لہکتا تھا مفت ہاتھ سے پھینک دیا وہ کیا ہے؟ کلام کا اثر اور اظہار اصلیت ہمارے نازک خیال اور باریک بین لوگ استعاروں اور تشبیہوں کی رنگینی اور مناسبت لفظی کے ذوق و شوق میں خیال سے خیال پیدا کرنے لگے اور اصلی مطلب کے ادا کرنے میں بے پروا ہو گئے۔ انجام اس کا یہ ہوا کہ زبان کا ڈھنگ بدل گیا اور نوبت یہ ہوئی کہ گداگر کوشش کریں تو فارسی کی طرح۔ پنج رقعہ اور مینا بازار یا فسانۂ عجائب لکھ سکتے ہیں۔ لیکن ایک ملکی معاملہ یا تاریخی انقلاب اس طرح نہیں بیان کر سکتے جس سے معلوم ہوتا جائے کہ واقعہ مذکور کیونکر ہوا اور کیونکر اختتام کو پہونچا اور اس سے پڑھنے والے کو ثابت ہو جائے کہ روئداد

کے وقت کی اور صورت حال معاملہ کی ایسی ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہوا اسی
طرح ہو سکتا تھا۔ دوسری صورت ممکن نہ تھی اور یہ تو ناممکن ہے
کہ ایک فلسفہ یا حکمت اخلاق کا خیال لکھیں۔ جس کی صفائی کلام
لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف لگائے اور اُس کے دلائل جو حسن بیان
کے پردہ میں برابر جلوہ دیتے جاتے ہیں وہ دلوں سے تصدیق
کے اقرار لیتے جائیں اور جس بات سے روکنا یا جس کام پر جھکنا
منظور ہو اُس میں پوری پوری اطاعت سننے والوں سے لے سکیں
یہ قیامت فقط نازک خیالی نے پیدا کی کہ استعارہ و تشبیہ کے انداز
اور مترادف فقرے تکیہ کلام کی طرح ہماری زبانِ قلم پر چڑھ گئے
بیشک ہمارے متقدمین اُس کی رنگینی اور نزاکت کو دیکھ کر بھولے
مگر نہ سمجھے کہ یہ خیالی رنگ ہمارے اصلی جوہر کو خاک میں ملانے والا
ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج انگریزی ڈھنگ پر لکھنے میں یا اُنکے
مضامین کے پورا پورا ترجمہ کرنے میں ہم بہت قاصر ہیں۔ نہیں! ہماری
اصلی انشا پردازی اس سررشتہ میں قاصر ہے۔

انگریزی تحریر کے عام اصول یہ ہیں کہ جس شے کا حال یا
دل کا خیال لکھئے تو اُسے اسطرح ادا کیجئے کہ خود وہ حالت گذرنے
سے یا اُس کے مشاہدہ کرنے سے جو خوشی۔ یا غم۔ یا غصہ۔ یا رحم۔ یا

خوف۔ یا جوش دل پر طاری ہوتا۔ یہ بیان وہی عالم اور وہی سماں دِل پر چھا دیوے۔

بے شک ہماری طرز بیان اپنی چُست بندش اور قافیوں کے مسلسل کھٹکوں سے کانوں کو اچھی طرح خبر کرتی ہے اپنے رنگین الفاظ اور نازک مضمون سے خیال میں شوخی کا لطف پیدا کرتی ہے۔ ساتھ اس کے مبالغہ کلام اور عبارت کی دھوم دھام سے زمین و آسمان کو تہ و بالا کر دیتی ہے۔ مگر اصل مقصود یعنی دلی اثر یا اظہار واقفیت ڈھونڈو تو ذرا نہیں چند مضمون ہیں کہ ہماری زبانوں پر بہت رواں ہیں۔ مگر حقیقت میں ہم ان میں بھی ناکام ہیں مثلاً ہم اگر کسی کے حُسن کی تعریف کرتے ہیں تو رشک حور غیرت پری پر قناعت نہ کرکے اُسے تپلا ناممکنات و محالات کا بنا دیتے ہیں۔ مگر کسی حسین کا حُسن خداداد خود ایک عالم ہے کہ جو کچھ آنکھوں سے دیکھ کر دلوں پر گذر جاتی ہے دل ہی جانتے ہیں۔ بس اسی کو اس طرح کیوں نہیں ادا کر دیتے کہ سننے والے بھی کلیجہ پکڑ کے رہ جائیں۔ ایک بلونت جوان کی تعریف کریں گے تو رستم۔ تہمتن۔ اسفندیار۔ روئیں تن۔ شیر بیشۂ دغا۔ نہنگ قلزم ہیجا وغیرہ وغیرہ لکھ کر صفحے سیاہ کر دیں گے۔ لیکن اُسکی بلند گردن۔ بھرے ہوئے ڈنٹر۔ چوڑا سینہ۔ بازوؤں کی گُلاوٹ پتلی کمر۔ غرض خوشنما بدن اور موزوں

ڈیل ڈول بھی ایک انداز رکھتا ہے اُسکی اپنی دلاوری اور ذاتی بہادری
بھی آخر کچھ ہے جس کے کارناموں نے اُسے اپنے عہد میں ممتاز کر رکھا
ہے اُسی کو ایک وضع سے کیوں نہیں ادا کردیتے۔ جسے سُن کر مُرادخیالوں
میں اکڑ۔ مکڑا اور کھلائے ہوئے دلوں میں امنگ پیدا ہو جاے۔
ایک چمن کی تعریف سے کبھی فلک کے سبز باغ اور گلشن انجم کے
دل پر داغ دیں گے۔ کہیں اُسے فردوس بریں اور جنات ردے زمیں
بنائیں گے۔ بلکہ ایک ایک پھول اور ایک ایک پتّے کی تعریف میں رنگ
رنگ سے ورق سیاہ کردیں گے مگر اُسکی ہریاول کا لہلہانا۔ پھولوں کا
چہچہانا۔ میٹھی میٹھی خوشبوؤں کا آنا۔ آب رواں کا لہرانا۔ موزوں درختوں،
گلزار کے تختوں کی بہار۔ ہوا کی مہک اور طوطی کی چہک پپیہے کی کوک۔ کوئل
کی ہوک۔ جو کہ روحانی تفریح کے ساتھ انسان کے دل پہ اثر کرتی ہے اُسکا
بیان اسطرح نہیں کرتے جسکے پڑھنے سے آنکھوں میں سما چھا جائے میدان
جنگ ہو تو زمین کے طبقوں کو اُڑا کر آسمان میں تلپٹ کردیتے ہیں اور
خون کے دریا ملکوں سے ملکوں میں بہادیتے ہیں۔ مگر اپنے موقعہ پہ وہ
تاثیر جس سے ایک بہادر کی بہادری دیکھ کر دلوں میں قوم کی ہمدردی
اور رفیق پر جان نثار کرنے کا ولولہ پیدا ہو۔ وہ نہیں۔
دوسرے کوچہ میں آکر علم کی تعریف پر اُترتے ہیں تو اُس کی برکت

سے پیر۔ پیغمبر۔ ملائک۔ فرشتہ بنادیتے ہیں۔ کاش اُسکے عوض میں چند ظاہر کُھلے کُھلے
فائدے بیان کردیں جس سے ہر شخص کے دل میں اُسکا شوق پیدا ہو اور جاہل
سمجھ جائے کہ اگر بے علم رہوں گا تو خواری و ذلّت کی زندگی سے دین دُنیا
دونوں خراب ہوں گے۔ ہماری تصنیفات میں اُس کا کچھ ذکر ہی نہیں
اور افسوس کہ اب تک بھی ہم نے اُس پر توجہ نہیں کی۔ انگریزی میں
بہت خیالات اور مضامین ایسے ہیں کہ ہماری زبان نہیں ادا کرسکتی۔
یعنی جو لطف اُن کا انگریزی میں ہے وہ اردو میں پورا ادا نہیں ہوسکتا۔
جو کہ حقیقت میں زبان کی ناطاقتی کا نتیجہ ہے اور یہ اہلِ زبان کے لئے
نہایت شرم کا مقام ہے۔

اگر شائستہ قوموں کی انشا پردازی سوال کرے کہ اُردو کی انشا کیوں
اس حالت میں مبتلا رہی؟ تو حاضر جوابی فوراً بول اُٹھے گی کہ قوم کی انشا
پردازی بموجب اُس کے حالات کے ہوتی ہے اور اُس کے خیالات
بموجب حالات ملک اور ترتیب ملکی کے ہوتے ہیں جیسے ہندوستان کی
تعلیم و شائستگی تھی اور بادشاہوں اور امیروں کی قدردانی تھی۔ ویسی
ہی انشا پردازی رہی۔ اور خاتمہ کلام اس فقرے پر ہوگا کہ کوئی پرند
اپنے بازوؤں سے بڑھ کر پر نہیں مارسکتا۔ اُس کے بازو فارسی سنسکرت
بھاشا وغیرہ تھے۔ پھر اُردو بیچاری انگلینڈ۔ یا روم۔ یا یونان کے محلوں پر

کیونکر جا بیٹھتی۔ مگر حقیقت میں عقدہ اس سوال کا ایک اور گرہ میں بند ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر ایک شے کی ترقی کسی ملک میں اُسی قدر زیادہ ہوتی ہے جس قدر شے مذکور کو سلطنت سے تعلق ہوتا ہے۔ یورپ کے ملکوں میں قدیم سے دستور رہے کہ سلطنت کے اندرونی اور بیرونی اور قوم کی ذاتی اور علمی لیاقتوں پر منحصر ہوتے تھے اور سلطنت کے کل انتظام اور اُس کے سب قسم کے کاروبار اُنھیں کے شمول اور اُنھیں کی عرق ریز تدبیروں سے قرار پاتے تھے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اُن کی تجویزوں کی بنیاد علمی اور عقلی اور تاریخی تجربہ کے زوروں پر قائم ہوتی تھی۔ پھر لیاقت مذکورہ بھی سیکڑوں ہی میں منحصر نہیں بلکہ ہزاروں میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان میں جہاں اور مہمات سلطنت ہیں وہاں ایک یہ بھی تھا کہ ہر امر تنقیح طلب جلسہ عام کے اتفاق رائے سے تحریروں اور تقریروں میں فیصل ہوتا تھا تو ادھر کی دنیا اُدھر ہو جاتی تھی پھر جب طرف ثانی اُس کے مقابل میں جواب ترکی بہ ترکی دیتا تھا تو مشرق کے آفتاب کو مغرب سے طلوع کر دیتا تھا اور اب تک بھی فقط تقریروں اور تحریروں کے زور سے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو متفق کر کے ایک رائے سے دوسری رائے پر پھیر لیتے ہیں۔ خیال کرنا چاہیئے کہ اُن کے بیان میں کسی طاقت اور زبان میں کیا کیا زور ہوں گے برخلاف ہندوستان کے کہ یہاں کی زبان میں اگر ہوئے

تو ایک بادشاہ کی خوش اقبالی میں چند شعرا کے دیوان ہوئے جو فقط تفریح طبع اور دلگی کا سامان ہے ۔ کُجا زمین کُجا آسمان ۔ نہ وہ جو ہر پیدا ہوا نہ کسی نے اُس کے پیدا کرنے کا ارادہ کیا ۔

باوجود اس کے اُردو کی خوش اقبالی اور خوش رواجی قابل رشک ہے کیونکہ اس کی اصل تو برج بھاشا ہے جو اپنی بہار جوانی میں بھی فقط ایک ضلع میں لین دین کی زبان تھی ۔ خود اُردو دلّی سے نکلی جس کا چراغ دلّی کی بادشاہت کے ساتھ گل ہونا چاہئے تھا ۔ پھر بھی اگر بیچوں بیچ ہندوستان میں کھڑے ہو کر آواز دیں کہ اس ملک کی زبان کیا ہے ۔ جواب میں سُنیں گے کہ اُردو اس کے ایک کنارے مثلاً پشاور سے چلو تو اوّل افغانی ہے ۔ اٹک اُترے تو پوٹھواری کچھ اور ہی کہتے ہیں ۔ جہلم تک داہنے پر کشمیر پکار رہا ہے کہ پوردلا ۔ لورولا یعنی ادھر آؤ بائیں پر مُلتان کہتا ہے کہ کھتے گھنّیا یعنی کہاں چلے ۔ آگے بڑھے تو وہ بولی ہے کہ پنجابی خاص اُسی کو کہتے ہیں ۔ اس کے بائیں پر پہاڑی ایسی زبان ہے کہ تحریر و تقریر سب سے الگ ہے ۔ ستلج اُتریں تو پنجابیت کی کمی سے لوگوں کی وضع ولباس میں بھی فرق شروع ہوتا ہے ۔ دلّی پہونچے تو اور ہی سما بندھا ہوا ہے ۔ میرٹھ سے بڑھے تو علی گڈھ میں بھاشا سے ملا جلا پورب کا انداز شروع ہو گیا ۔ کانپور ۔ لکھنؤ سے الٰہ آباد

تک یہی عالم ہے۔ جنوب کو ہٹیں تو مارواڑی ہو کر گجراتی اور دکھنی ہو جاتی ہے۔
پھر ادھر آئے تو آگے بنگالہ ہے اور کلکتہ پہونچکر تو عالم گوناگوں۔ خلق خدا اور
ملک خدا ہے۔ جسکا امتیاز حد و اندازے سے باہر ہے۔ میرے دوستو تم جانتے ہو
کہ ہر شے کی اصلیت اور حسن و قبح کے واسطے ایک مقام ایسا ہوتا ہے جیسے سکے
کے لئے ٹکسال۔ کیا سبب ہے کہ ابتدا میں زبان کے لئے دلّی ٹکسال تھی؟
وجہ اسکی یہ ہے کہ وہ دارالخلافت تھی۔ دربار میں خاندانی اُمرا اور امیرزادے
خود صاحب علم ہوتے تھے۔ اُن کی مجلسیں اہل علم اور اہل کمال کا مجمع ہوتی
تھیں۔ جنکی برکت سے طبیعتیں گویا ہر شے کے سلیقے اور شایستگی اور
لطافت و ظرافت کا قالب ہوتی تھیں۔ اسی واسطے۔ گفتگو۔ لباس۔
ادب آداب۔ نشست برخاست۔ بلکہ بات بات ایسی سنجیدہ اور پسندیدہ
ہوتی تھی کہ خواہ مخواہ سب کے دل قبول کرتے تھے۔ ہر شے کے لئے
ہمیشہ نئی نئی تراش اور نئی نئی اصلاحیں اور ایجاد و اختراع وہاں سے
ہوتے تھے اور چونکہ دارالخلافت میں شہر شہر کا آدمی موجود تھا۔ اس لئے
وہ دلپذیر ایجاد اور اصلاحیں ہر شہر میں جلد عام ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ
بہادر شاہ سے پہلے تک دلّی ہر بات کے لئے سند رہی اور انھیں
صفتوں سے لکھنؤ نے بھی سند افتخار حاصل کی۔ لکھنؤ کو دیکھ کر سمجھ لو
کہ دل پسند ایجادوں اور رنگین باتوں کا ایجاد ہونا کسی شہر کے اینٹ پتھر

کی تاثیر نہیں ہے۔ ہاں شایستہ اور رنگین مزاج لوگ جہاں جمع ہونگے
اور دلپذیر باتوں کے سامان موجود ہوں گے وہیں سے وہ پھول کھلنے
لگیں گے۔ چنانچہ وہی دلّی کے لوگ اور اُن کی اولاد تھی کہ جب تباہی
سلطنت اور آبادی لکھنؤ کے سبب سے وہاں پہونچے تو چند روز میں
ویسی ہی تراشیں وہاں سے نکلنے لگیں لکھنؤ دار السلطنت ہوگیا اور اسکے
ضمن میں زبان بھی دلّی کی اطاعت سے آزاد ہوگئی۔ اس آزادی کی
کی۔ ناسخ۔ آتش۔ ضمیر۔ خلیق وغیرہ اہل کمال نے نبیاد ڈالی اور انیس
دبیر۔ رند۔ خواجہ وزیر اور سرور نے خاتمہ کر دیا۔ اُنھوں نے زبان کو
بڑی ترقّی دی مگر اکثر اُن میں ایسے ہوئے کہ جنگل کے صاف کرنے کو
اُٹھے مگر اُس میں دریا کا دہانہ لا ڈالا یعنی صفائی زبان کی جگہ لغات
کی بوچھار کر دی۔ یہاں تک کہ لکھنؤ کا ورق بھی زمانہ نے اُلٹ دیا۔
اب آفتاب ہماری ملکہ آفاق کا نشان ہے جسے حکم نہیں کہ قلمرو کے
خط سے باہر حرکت کرسکے۔ ڈاکوں اور ریل گاڑیوں نے پورب سے
پچھم تک دوڑ کر بھانت بھانت کا جانور ایک پنجڑے میں بند کر دیا۔
دلّی برباد۔ لکھنؤ ویران۔ دونوں کے سندی اشخاص کچھ پیوند زمین
ہوگئے۔ کچھ دربدر خاک بسر۔ اب جیسے اور شہر ویسے ہی لکھنؤ۔ جیسے
چھاونیوں کے بازار ویسے ہی دلّی۔ بلکہ اُس سے بھی بدتر۔ کوئی

شہر ایسا نہیں رہا جس کے لوگوں کی زبان عموماً سند کے قابل ہو۔ کیونکہ شہر میں ایسے چیدہ اور برگزیدہ اشخاص جن سے کہ وہ شہر قابل سند ہو صرف گنتی کے لوگ ہوتے ہیں اور وہ زمانہ کی صدہا سالہ محنتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے بہت مر گئے۔ کوئی بڈھا جیسے خزاں کا مارا پتا کسی درخت پر باقی ہے۔ اُس بڈھے کی آواز کمیٹیوں کے غُل اور اخباروں کے نقار خانوں میں سُنائی بھی نہیں دیتی پس اب اگر دلّی کی زبان کو سندی سمجھیں تو وہاں کے ہر شخص کی زبان کیونکر سندی ہو سکتی ہے۔ ہوا کا رُخ اور دریا کا بہاؤ نہ کسی کے اختیار میں ہے نہ کسی کو معلوم ہے کہ کدھر پھرے گا۔ اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ اب زبان کیا رنگ بدلے گی ہم جہاز بے ناخدا ہیں۔ توکّل بخدا کر بیٹھے ہیں۔ زمانہ کے انقلابوں کو رنگ چمن کی تبدیلی سمجھ کر دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں آزاد ؎

قسمت میں جو لکھا تھا سو دیکھا ہے اب تلک
اور آگے دیکھئے ابھی کیا کیا ہے دیکھنا

محمد شاہ کا زمانہ اور نادر شاہ کا آنا

ماخوذ از قصص ہند حصہ دوئم

روشن اختر شاہزادہ اگرچہ قید خانے میں تھا۔ لیکن دنیا کی آفتوں سے محفوظ اماں کے پہلو میں بخت بیٹھا تھا۔ دفعتہً ستارہ اقبال اوج پر آیا۔ چند امیروں نے آکر مجرا کیا اور دست بستہ عرض کی کہ تخت حاضر ہے۔ چل کر اپنے قدم سے رونق دیجئے۔ شاہزادہ تو لڑکا تھا اور برسوں سے قید خانے میں آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ مگر ماں دیکھ رہی تھی کہ جو بادشاہ ہوتا ہے وہی تخت کی قربانی ہوتا ہے۔ اس لئے ہاتھ جوڑتی پردے سے نکل آئی کہ برائے خدا مجھے تاج نہیں چاہئے۔ اس یتیم کا سر سلامت رہنے دو اور سلطنت سے معاف رکھو۔ امیروں نے ہر طرح عہد و پیمان سے اس کی تشفی کی بعد اس کے خود چتر لگا کر شاہانہ عظمت سے لے گئے اور تاج سر پر رکھ کر محمد شاہ بادشاہ غازی بنا دیا۔ شاہزادہ یا تو قید خانہ کی کوٹھری میں بند پڑا تھا یا دفعتہً تمام ہندوستان کا شہنشاہ ہو گیا۔ اکبری اور جہانگیری دربار میں سارے

امیروں وزیروں کو سامنے ہاتھ باندھے دیکھا۔ آنکھیں کھل گئیں۔ مگر دل میں حیران تھا کہ یہ عجب بادشاہت ہے۔ محل سے نکلنا ہے تخت پر آبیٹھنا ہے۔ تخت سے اُٹھنا ہے۔ اندر چلا جانا ہے! معلوم نہیں کہ دربار کیا ہے اور ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ ماں کے سوا کوئی اپنا نظر نہیں آتا تھا۔ جس سے دل کا حال کہے اور کچھ مشورہ کرے۔ وزیر اور سپہ سالار دونوں دربار کے مالک تھے۔ جو چاہتے تھے سو کرتے تھے اور انھیں کے بھائی بند سارے کاروبار میں پھیلے ہوئے تھے باقی سب امیر برائے نام تھے۔

محمد شاہ تو لڑکا ہی تھا۔ ماں نے پھر بھی زمانے دیکھے ہوئے تھے۔ وہ سمجھی کہ وزیر اور سپہ سالار کے پنجے سے رہائی ممکن نہیں۔ مگر اتنی بات ہے کہ یہ سید ہیں اور باقی جو دربار کے امیر ہیں اکثر ترک ہیں اور ہر چند وہ بھی بڑے بڑے حوصلے والے ہیں۔ مگر اتفاق وقت سے دب گئے ہیں اور ان دونوں فریقوں کا آپس میں بگاڑ ہے بلکہ مذہب میں بھی اختلاف ہے غرض ماں نے بیٹے کو سمجھایا کہ تُرکوں سے جوڑ کر سیدوں کو توڑو بات بن جاتی ہے چنانچہ بادشاہ نے بھی اس بات کا خیال شروع کیا۔ ساتھ ہی زور طالع یہ ہوا کہ وزیر اور سپہ سالار کو بعض کاموں کے لئے دربار سے دور ہونا پڑتا تھا۔ کاروبار میں بادشاہ سے گفتگو کرنے کے لئے اور اُمرا کو بھی رستے ملنے لگے۔ اگرچہ ان دونوں کے معتبر آدمی ہر وقت

موجود رہتے تھے مگر بڑی بات یہ ہوئی کہ محمد شاہ تُرکی زبان جانتا تھا۔ چنانچہ
ان سے اسی زبان میں باتیں کیا کرتا اور اس پردے میں جو نکتے مطلب
کے ہوتے وہ بھی ہو جاتے۔ رقیبوں کے آدمی کھڑے دیکھا کرتے۔ نہ کچھ سمجھتے
نہ کچھ کہہ سکتے۔ رفتہ رفتہ بادشاہ کی حمایت سے تُرکوں نے زور پایا اور ان
کے زور سے بادشاہ کی بادشاہت میں زور آیا۔ چنانچہ وزیر اور سپہ سالار
مارے گئے اور ان کی قوم کا نام دربار سے مٹ گیا۔ اگرچہ صوبوں میں اَب
بھی فساد تھے مگر جب دربار غبار سے صاف ہوا تو بادشاہ کی رنگین طبیعت نے
اپنا اصلی رنگ دکھانا شروع کیا چنانچہ ملک کا انتظام امیروں اور وزیروں
پر چھوڑا اور خود ناچ رنگ۔ شراب کباب سے ایسا عیش کے دریا میں ڈوبا
کہ کسی بات کی خبر نہ رہی۔ رعیت بھی پشتوں سے امن چین کے ساتھ انعام
واکرام سے مالامال ہوتی چلی آتی تھی۔ گھر گھر عیش وعشرت سے دن عید
رات شب برات ہوگئی۔ ایسی قدر دان اور عالیشان سلطنتوں میں علما
وشعرا اور عام اہل کمال کا کیا ٹھکانا تھا۔ ہزاروں آدمی جمع تھے۔ مگر بادشاہ
کی طبیعت کو رنگینی پر مائل دیکھ کر سب رنگین ہوگئے۔ موزوں طبع۔ لطیفہ گو
نوجوان آکر مصاحبت میں داخل ہوئے بلکہ پُرانے بڈھے سر سے پاؤں
تک خضاب ہوگئے۔ اسی عالم میں بادشاہ خود بھی شعر کہتے تھے۔ چنانچہ
فارسی کا شعر ہے ؎

بار در بر صبح بر سر فکر بر جالش کنید   عاشقاں شب می رود زنجیر در پالش کنید

اور اُردو کا شعر ہے ؎

پیری میں کسطرح کروں سیر جہاں کی   دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گزری کا

عمدۃ الملک نواب امیر خاں ایک قدیم الخدمت اور خاندانی امیرزادہ تھا کہ دلیرانہ ہمت اور امیرانہ دماغ رکھتا تھا۔ ساتھ اس کے لطیفہ گوئی اور بزلہ سنجی کا یہ عالم تھا کہ پھلجھڑی کی طرح مُنہ سے پھول جھڑتے تھے۔ خلوت و دربار میں ایسی گُل افشانیاں کرتا تھا کہ تمام دربار لوٹ لوٹ جاتا تھا۔

لطیفہ۔ ایک دن بادشاہ نے پوچھا کہ امیر خاں یہ جو پوت۔ سپوت کپوت لوگوں میں زبان زد چلے آتے ہیں۔ اب بھی کچھ ان کی اصل ہے؟ عرض کی کہ حضور اسی دربار میں سب موجود ہیں۔ بادشاہ نے کہا کیونکر؟ کہا پوت تو یہی۔ جیسے حضور یعنی سلطان ابن سلطان اور سپوت برہان الملک کہ محمد امین نام ایک مغل ایران سے آیا۔ یہاں حضور کے تصدق سے وہ مرتبہ پایا کہ باپ دادا کا فخر ہو گیا اور کپوت یہ خانہ زاد کہ باپ دادا حضور کے بزرگوں کی جاں نثاری میں اعلیٰ عہدوں پر ممتاز رہے اور فدوی اس حالتمیں گرفتار۔

لطیفہ۔ ایک دن امیر خاں حضور میں اپنے بزرگوں کی جاں نثاریاں اور شاہجہاں اور عالمگیر کی قدردانیاں بیان کر رہا تھا۔ اس میں یہ بھی

کہا کہ میرا باپ کابل میں ناظم تھا اور اپنی عقل و تدبیر سے اسقدر مورد عنایات تھا کہ کئی مہمیں دکن میں فتح ہوئیں اور عالمگیر نے اُن کی فتح اس کے نام پر لکھی یہ ننگ خاندان اس حال میں حضور کے سامنے حاضر ہے۔ برہان الملک نے کہا کہ

پسر نوح با بداں بنشست خاندانِ نبوتش گم شد

امیر خاں نے کہا کہ دوسرا شعر بھی تو پڑھیئے کہ

سگ اصحاب کہف روزے چند پے نیکاں گرفت مردم شد

لطیفہ۔ جب امیر خاں صوبہ الہ آباد سے آئے تو بادشاہ نے پوچھا کہ امیر خاں ہمارے لئے کیا لائے؟ عرض کی کہ دو ہزار احمق۔ بعد اسکے اپنے باوفا سپاہیوں کو جو وہاں سے ساتھ آئے تھے۔ موجودات کے لئے حاضر کیا۔ بادشاہ نے جب سجیلے جوان اور انکی وردیاں اور سامان زینے تو بہت خوش ہوئے اور کہا کہ ان ہی لوگوں کو تم احمق کہتے تھے۔ عرض کی کہ حضور نہ میرے پاس خزانہ۔ نہ ملک فقط زبانی بات پر تین سو کوس چلے آئے یہ احمق نہیں تو اور کون ہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ خیر ان کو اپنی رفاقت میں رکھو۔ تنخواہ حضور سے مجرا ہوا کرے گی۔

غرض ایسے ایسے لوگوں کی صحبتیں تھیں اور عیش و عشرت کے ہجوم تھے مہتاب باغ اور حیات بخش کے باغوں کو سجا کر طلسمات کا نمونہ کر دیا۔ نہروں میں نواڑے پڑے رہتے۔ بادشاہ ان میں بیٹھتے۔ ناچ رنگ کے جلسے جمتے اور شراب کے دور چلتے۔ جب برسات آتی اُن کے ہاں بہار آتی قطب صاحب

کے جنگل سبزے سے ہرے بھرے ہو جاتے۔ یہ شہر کو چھوڑ کر وہاں جا رہتے۔ حکم تھا کہ ابر سیاہ ہمارا نقیب ہے جب گرجنے کی آواز آیا کرے اسی وقت کمربندی ہو جایا کرے۔

تمام اُمرا ایک ایک ملک اور علاقے پر تعینات تھے مگر بہار دربار کے لطف اُٹھانے کو نائب اپنے وہاں چھوڑے اور خود دربار میں چلے آئے۔ ظاہر ہے کہ جہاں اہل دربار ایسے ایسے خیالات میں ہوں وہاں ملک کے انتظام کا کیا ٹھکانا۔ مگر تازہ گُل یہ کھلا کہ وزیر اور سپہ سالار کے توڑنے کے لئے سب نے تجویز کی کہ نظام الملک آصف جاہ کو دکن سے بُلانا چاہیے۔ چنانچہ وہ آیا۔ کُل کاروبار اُس کے سپرد ہو گئے اور ہر مقدمہ اس کی صلاح سے طے ہونے لگا مگر اس دیرینہ سال نے عالمگیر کے عالم دیکھے ہوئے تھے۔ دربار کے رنگ دیکھ کر بہت گھبرایا اور بادشاہ کو صلاحیت پر لانا چاہا۔ یہاں کے رنگین مزاج اس سے بھی گھبرائے اور اپنے توڑ جوڑ مارنے لگے۔ لیکن چونکہ آصف جاہ ایک رتبے کا شخص تھا۔ ان کے وار اس کے مقابلے کے قابل تو نہ ہوتے تھے۔ البتہ دق کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن بادشاہ نے اسے ملبوس خاص کا خلعت اور وزارت کا عہدہ دیا۔ اہل دربار کو اس بات کا داغ ہوا چنانچہ توڑ اس کا یہ کیا۔ اسی بات کو ناچ کے جلسے میں ایک بھانڈ نے بادشاہ کو بہت خوش کیا۔ یاروں نے اسے بھی ملبوس خاص

کا خلعت دلوایا۔ اس پر بھی اس دل شکستہ نے جو طریقے اور آئین بادشاہی درباروں کے ہیں۔ وہ جاری کرنے شروع کئے۔ خلوت اور جلوت میں بادشاہ کے وقتوں کی تقسیم کی اور کاروبار ملک کے پیش کرنے لگا رنگین مزاجوں نے اُس کی ہنسی اُڑانی شروع کر دی۔ رنگیلے بادشاہ کو کچھ تو خود یہ کام وبال معلوم ہوتے تھے۔ کچھ امیروں نے بہکایا۔ چنانچہ آصفجاہ کی عرض معروض پر بادشاہ کی بھی وہ توجہ نہ رہی۔ ایک امیر نے اپنی جگہہ یہ بھی کہا کہ کیسا بندر کی طرح بادشاہ کے سامنے اُچھلتا پھرتا ہے۔ آصفجاہ کو بھی دم دم کی خبر لگتی تھی۔ سُن کر کہا کہ اگر یہی حال ہے تو دیکھو گے فصیل قلعہ کے ایک ایک کنگرہ پر بندر ناچے گا۔ آخر تنگ ہو کر کسی بہانہ سے اپنے علاقہ پر چلا گیا کہ ایسے مسخروں میں رہ کر وزیر ہندوستان کہلانے سے حیدرآباد کی صوبہ داری بہتر ہے۔ اتفاقاً ان ہی دنوں میں نادر شاہ افغانوں کو ایران سے نکالتا ہوا قندھار تک آیا تھا اور افغان ادھر سے نکل کر تمام کوہستان کابل میں پھیل گئے تھے۔ چونکہ کابل میں دربار دہلی کی طرف سے صوبہ رہتا تھا۔ اس لئے نادر شاہ نے محمد شاہ کے پاس اپنا ایلچی بھیجا کہ تم بھی اپنے صوبے کے نام حکم بھیجدو تاکہ دونوں طرف سے دبا کر اس فرقے کو قرار واقعی گوشمالی دیں۔ یہاں ان دنوں میں عیش و عشرت کے غل سے آواز تک بھی نہ سُنائی دیتی تھی چنانچہ ایلچی راہ میں مارے گئے

اور کسی نے خبر بھی نہ لی۔ کہتے ہیں کہ آصف جاہ خود تو دکن کو گیا تھا مگر نادرشاہ کو خفیہ ایلچی بھیج کر سنکار کیا کہ آپ بے تکلف چلے آئیں۔ یہاں دلّی تک میدان صاف ہے۔ چنانچہ چند روز کے بعد نادرشاہ نے ایلچیوں کی تباہی سُن کر پھر مراسلہ لکھا اور آخیر کو خطوں کی بے جوابی نے خود اُسے بھی ہندوستان کی طرف کھینچا مگر یہاں یہ حال تھا کہ عام خبروں کے علاوہ کابل۔ لاہور وغیرہ کے حاکموں کی عرضیاں بھی آتی تھیں اور کوئی خبر نہ ہوئی تھی بلکہ جب لوگ نادرشاہ کے آنے کی خبریں دیتے تو اُمرائے دربار سُن کر خفا ہوتے اور کہتے کہ لوگوں کے گھر بہت بلند ہیں۔ دُور سے نادرشاہ کا لشکر دکھائی دیتا ہے۔ جب ناچار ہو کر نادرشاہ نے کابل کو آن گھیرا تو وہاں کے حاکم نے نہایت اضطراب سے عرضی لکھی۔ چنانچہ جس وقت خریطہ پہونچا۔ بادشاہ مہتاب باغ میں عالم آب کا تماشا دیکھ رہے تھے اور سامنے ناچ ہو رہا تھا۔ چونکہ اسوقت نہایت سرور کا عالم تھا۔ عرضی کو لے کر گوشہ اسکا شراب میں ڈبویا اور یہ مصرع پڑھا۔ ع این دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولی

چونکہ آصف جاہ کی دانائی اور تجربہ کاری کو اس کے حریف بھی مانتے تھے۔ اس لئے نادرشاہ کی آمد آمد سُن کر اسے بھی دکن سے بلوایا۔ ادھر نادرشاہ نے کابل کو فتح کر کے پھر نامہ لکھا اور اپنا دوسرا ایلچی جو دربار دہلی میں کاہوا تھا اسے طلب کیا یہاں دربار میں یہ مقدمہ اُلجھ رہا تھا کہ کئی خط

اور کئی ایلچی آئے اور ادھر سے جواب بھی نہیں گیا۔ اب جواب کیا لکھیں تو اسمیں القاب کیا لکھیں۔ کیونکہ وہ اصل میں نادر قلی ہے۔ کوئی خاندانی بادشاہ نہیں ہے۔ اتنے میں خبر آئی کہ اس کا لشکر اٹک اُتر آیا۔ یہاں بھی کوچ کی تیّاریاں ہونے لگیں اور چلتے چلتے دو مہینے میں کرنال پہونچے۔ سب نہر کے کنارے برات کی طرح پڑے تھے اور جس طرح لوگ شہر سے عیدگاہ کو جاتے ہیں۔ اس طرح آتے تھے اور لشکر میں شامل ہوتے جاتے تھے۔ برہان الملک کا انتظار ہو رہا تھا۔ کیونکہ اسکی فوج توپ خانے کی پشت گرمی سے ان دنوں بہت نامور تھی۔ اتفاقاً جس دن وہ آکر لشکر میں شامل ہوا۔ اس دن نادر شاہ بھی پاس پہونچ گیا تھا اور یہاں کسی کو خبر بھی نہ تھی۔ برہان الملک نے دربار کی بے پروائی کی شکایتیں کرکے کوچ کی تاکید شروع کی۔

اسی دن کچھ گھسیارے کچھ زخمی کچھ بدحواس دوڑے آئے کہ ہم جنگل میں گھاس کھودنے گئے تھے۔ نادری قراولوں[۵] نے کئی آدمیوں کو گرفتار کرلیا اور ہم نے بھاگ کر اپنے تئیں یہاں پہونچایا ہے۔ امرانے جمع ہوکر پھر گفتگو شروع کی اتنے میں خبر آئی کہ چند قزلباش نادری

---

[۵] قراول چند سرداروں کا مجموعہ ہوتا ہے جو فوج سے آگے بڑھکر کئی کوس تک گھوڑے مارتا پھرتا ہے تاکہ دشمن کی فوج اور گرد و پیش کے حالات کی خبر رہے اور موقع پائے تو دست برد بھی کرجاتا ہے۔

برہان الملک کے ڈیروں پر ہاتھ مار گئے۔ برہان الملک تلوار ٹیک کر اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ صاحب اب کونسی بات باقی ہے۔ جس کا انتظار کیا جائے؟ اسی وقت فوج لے لڑنے کو روانہ ہوا گر خان دوران نے بادشاہ کو اطلاع دی۔ انھوں نے آصف جاہ کو خبر کی۔ آصف جاہ بولا کہ پہر دن باقی ہے۔ برہان الملک کو روکنا چاہئے کیونکہ لشکران کا منزلیں مارتا ہوا آیا ہے۔ اِس وقت بے موقع جراءت کرنی مناسب نہیں۔ کل توپ خانہ سامنے رکھ کر اور سب لشکر کو ترتیب دیکر بند وبست سے لڑیں تو مناسب ہے۔ بادشاہ نے یہی بات خان دوران کو کہلا بھیجی۔ خان دوران سنتے ہی بگڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ بڑے حیف کی بات ہے! ایسا جوان مرد سردار آقا کے نمک پر نثار ہونے جائے اور ہم پہلو میں بیٹھے اس کے مرنے کا تماشا دیکھیں۔ چنانچہ بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ برہان الملک اب مقابلے میں جا پڑے ہوں گے۔ اس لئے واپس بلانا مصلحت نہیں ساتھ ہی خود ہاتھی پر بیٹھ کر فوج کو روانہ ہوا اور آدھ کوس کا فاصلہ دے کر برہان الملک کے پہلو میں فوج جما دی۔

نادر شاہ بھی سنتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور فوج کے تین حصّے کر کے ایک اپنے ساتھ رکھ دو کو دولوں کے مقابلہ میں ڈالا۔ قزلباشوں نے برابر حملے پر حملہ کرنا شروع کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں عیش پروردہ فوجیں

پریشان ہوگئیں۔ بہت سے سردار مارے گئے اور خان دوران زخمی ہوکر میدان سے پھرے۔ یہاں شکست کی ہوا اڑتے ہی خان دوران کے خیمے ڈیرے لٹ کر سب کارخانوں کی خاک اُڑ گئی تھی۔ اتنا بھی نہ تھا کہ نیم جاں لاشے کو سائے میں رکھیں۔ غرض ایک بہوپہ کہیں سے لیکر اس میں اُتارا۔ اتنے میں بادشاہ کی طرف سے چند خواجہ سرا آئے اور آصف جاہ وغیرہ بھی عیادت کو پہونچے۔ تھوڑی دیر میں اس بیچارے نے ذرا آنکھ کھولی اور آہستہ سے اتنا کہا کہ خیر ہم نے تو اپنا کام کرلیا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام جانے مگر اتنا کہتے ہیں کہ بادشاہ کو نادر کے پاس اور نادر کو شہر میں نہ لے جانا۔ جس طرح ہوسکے اس بلا کو یہیں سے ٹال دینا۔

اُدھر سے برہان الملک اور اس کے چند رفیق میدان میں رہ گئے تھے۔ وہ جوانمرد ہاتھی پر بیٹھا تیر مار رہا تھا کہ قزلباش چاروں طرف سے گھر آئے۔ ایک جوان نیشاپوری اس کا ہموطن گھوڑا اُڑا کر پہونچا اور آواز دی کہ اے محمد امین! دیوانہ شدۂ۔ بکہ جنگ میکنی و بچہ اعتماد جنگ میکنی؟ برہان الملک نے ہاتھ روک لیا۔ قزلباش نے نیزہ زمین پر گاڑ گھوڑے کی باگ ڈور اس سے باندھی اور جھپٹ کر رسا پکڑ ہودج کے اندر جا بیٹھا۔ برہان الملک ایران کے دستوروں سے واقف تھا۔ کمان ہاتھ سے رکھ دی اور اپنے تئیں پنجۂ تقدیر کے حوالے کیا۔ قزلباش ہاتھی

کو گھیر کر اپنے لشکر میں لے گئے۔ نادر شاہ نے جرم بخشی کر کے عنایت فرمائی اور چونکہ شام ہو گئی تھی۔ فوج لے کر اپنے خیمہ گاہ کی طرف پھرا۔ برہان الملک کو اپنے ساتھ دستر خوان پر بٹھایا۔ چنانچہ اس نے مصلحت آمیز باتیں کر کے نادر شاہ کو اس بات پر راضی کر لیا کہ حضور ایک معقول نذرانہ لیں اور یہیں سے واپس تشریف لے جائیں۔ نادر شاہ اس بات پر راضی ہو گیا۔ برہان الملک نے ایک عریضے میں یہ سب حال اپنے بادشاہ کو لکھا اور رقعہ آصف جاہ کو بھیجا کہ تم آؤ اور اس امر کا فیصلہ کر دو۔ یہاں سب دریائے حیرت میں غرق بیٹھے تھے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے! اور حیران تھے کہ کیا کرنا چاہئے۔ یہ خبر سنتے ہی خوش ہو گئے۔ محمد شاہ نے فوراً آصف جاہ کو روانہ کیا۔ اس نے برہان الملک کے ذریعے سے نادر کی ملازمت حاصل کی اور بعد گفتگو کے یہ ٹھہرایا کہ دو کروڑ روپیہ نعل بہا[۵] لیجئے اور یہیں سے تشریف لے جائیے۔ نادر شاہ نے یہ بات منظور کی اور آصف جاہ عہد و پیمان کر کے وہاں سے رخصت ہوا مگر محمد شاہ کے سامنے جا کر ان کاموں کو اپنی کارگزاری اور دولت خواہی کے لباس میں ظاہر کیا یعنی برہان الملک کی حسن خدمت کو اڑا دیا۔ حضور سے خان دوران اور امیر الامرائی کا خطاب اور خلعت بیش بہا آصف جاہ کو عنایت ہوا۔ برہان الملک کا ذکر بھی کسی نے نہ کیا دوسرے دن محمد شاہ کی ملاقات کی

---

[۵] مصارف جنگ اور خرچ راہ کے روپے کو نعل بہا یا نعلبندی کا روپیہ کہتے ہیں۔

ٹھہری۔ بادشاہ ادھر سے بڑے توزک و احتشام کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اُدھر نادر نے اپنے بیٹے کو استقبال کے لئے بھیجا۔ وہ رستے میں آ کر ملا۔ بادشاہ نے تخت رواں کو زمین پر رکھوا کر ملاقات کی۔ اس نے فرزندانہ طور سے معانقہ کیا اور ہمرکاب ہو کر نادر شاہ کے پاس لے گیا۔ نادر شاہ لب فرش تک استقبال کو آیا۔ اپنی مسند پر نہایت تعظیم سے بٹھایا بعد اس کے برادرانہ اور دردمندانہ باتیں شروع کیں۔ چائے آئی اس کا دور چلنے لگا۔ نادر شاہ اس وقت برک کی قبا۔ اُس پر قراقلی یعنی سیاہ پوست برّے کا خفتان۔ اس پر ایک برکی چغہ پہنے بیٹھا تھا۔ سر پر کلاہ[ع] پا پاخ تھی۔ ادھر محمد شاہ شبنم کا کرتہ۔ ڈھاکے کی ململ کا جامہ پہنے تھے اور سر پر جو دستار تھی۔ اس سے بھی گھبرائے تھے۔ برابر پنکھا ہوتا تھا۔ نادر شاہ سے کہا کہ "رخت شما بسیار گرم است۔ برتن گرانی نمی کنند؟" نادر شاہ نے آہ سرد بھر کر کہا کہ برادر جان من! ہمیں رخت گرم است کہ ما را از ایران تا بہ اینجا رسانید۔ لطافت لباس شماست کہ نگزاشت از دہلی تا باینجا حرکت کنید۔ غرض بادشاہ نے ہنسی خوشی یہاں سے مراجعت کی۔ برہان الملک وہاں امیر الامرائی کے منصب کو اپنا حق سمجھے بیٹھا تھا۔ اس نے جب آصف جاہ کے خلعت و خطاب کا حال سُنا تو بہت بگڑا اور نادر شاہ سے کہا کہ حضور نے کیا غضب کیا جو ہندوستان کے قارونی

ع یہ لمبی ٹوپی بھی پوست برہ یعنی سیاہ دنبے کی کھال کی ہوتی ہے۔

خزانے چھوڑکر دو کروڑ روپئے پر رضامند ہو گئے یہ رقم تو فقط غلام ادا کرسکتا ہے اور بادشاہی خزانے اور امرا اور مہاجنوں کے گھرانوں کے کیا ٹھکانے ہیں! البتہ شہر یہاں سے چالیس کوس ہے حضور وہاں تک تکلیف فرمائیں نادرشاہ خوش ہوگیا اور اسی وقت آصف جاہ کو بلا بھیجا۔ وہ خوشی خوشی پھر حاضر ہوا۔ اسے حکم ملا کہ تم ٹھہرو اور اپنے بادشاہ کو بلالو۔ آصف جاہ نے کہا کہ عہدنامے میں یہ نہیں ٹھہرا تھا۔ نادر نے کہا کہ ملک اور سلطنت اور بادشاہ کی عزت و آبرو سے ہمیں کچھ تعرض نہیں۔ ہم فقط ایک ملاقات اور کرنی چاہتے ہیں۔ آصف جاہ نے ناچار بادشاہ کو لکھا۔ بہت سے امرا اور نوکر ادھر سے ساتھ چلنے کو تیار ہوئے مگر وہ فقط عمدۃ الملک وغیرہ چند امیروں اور چند خواجہ سراؤں کو لے کر آئے۔ نادرشاہ نے عزت و احترام کیساتھ الگ خیمہ میں اُتروا دیا اور کہا کہ بھائی محمد شاہ سلطنت اور دربار کا سامان مع حرم سرا کے منگوالو اور خاطرجمع سے یہیں رہو۔ لشکر میں بھی حکم بھیج دیا کہ جو چاہے ہمارے لشکر میں آجائے۔ اور جو چاہے دلّی چلا جائے بعد اسکے اپنا فرمان اور بادشاہ سقہ ایک اپنے سردار کو دلی لیکر شہر کو روانہ کیا۔ اس نے جاتے ہی قلعہ دار سے کنجیاں لیں اور سب کارخانوں پر قبضہ کر لیا۔ لشکر کے لوگ پریشان ہو کر بھاگے۔ بہتوں کو ولائیتوں نے لوٹ کر باندھ لیا جو ان سے بچے وہ رستے کے گوجروں نے مارے۔ جیتے بچے تو ننگے بچے گھر پہونچے۔ دوسرے

دن نادر شاہ بھی شاہ کو لے کر چلے اور دلّی میں داخل ہوئے۔ پانچ چار دن کے بعد عید قربان آئی۔ مسجد میں خطبہ نادر شاہ کے نام سے پڑھا گیا اور چونکہ دُھرا دربار تھا اس لئے بڑی دھوم کا توزک و احتشام ہوا مگر قربانی اس عید کی عجیب وغریب ہوئی یعنی عصر کے وقت تک تمام شہر میں امن و امان سے عیش وعشرت ہو رہی تھی۔ جو دفعتہً بھنگیڑ خانے میں بیٹھے بیٹھے ایک بھنگڑ بولا کہ واہ محمد شاہ رنگیلے! آخر بادشاہی پیچ کھیل ہی گیا دوسرا بولا کیا؟ اُس نے کہا کہ حرم سرا میں موقع تاک کر ایک قلماقنی[۵۱] سے مغلے[۵۲] کو مروا دیا۔ یہ ہوائی دفعتہً اُڑی اور ہوا کی طرح تمام شہر میں پھیل گئی غضب یہ ہوا کہ نادری سپاہی جو ایک ایک دو دو گلی کوچوں میں بے تکلف پھرتے تھے۔ انھیں لوگوں نے بے وارثا سمجھ کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ رات کو نادر کو خبر پہونچی۔ اس نے فوج کو حکم دیا کہ اپنی جگہہ پر قائم رہو اگر تم پر چڑھ کر آئیں تو جواب دو، نہیں تو چپ چاپ بیٹھے رہو۔ رات

---

۵۱ قلماق اگرچہ ترکوں میں ایک فرقے کا نام ہے مگر ہندوستان میں قلماقنی اور اردابیگنی ان عورتوں کو کہتے تھے جو اسلحۂ جنگ سے سجی رہتی تھیں اور حرم سرا میں سپاہیوں کی طرح پہرے وغیرہ کا کام کرتی تھیں۔

۵۲ یعنی نادر شاہ کو مروا ڈالا۔

بھر برابر تلوار چلتی رہی اور صبح تک سات سو ولایتی شہر میں کٹ گیا۔ افسوس یہ کہ ارکانِ دربار چپکے بیٹھے تماشا دیکھا کئے بلکہ چند اشخاص جن کو نادر شاہ نے کہہ کر اپنے گھر لے گئے تھے۔ وہ بھی مارے گئے۔ نادر نے صبح کو اُٹھ کر پوچھا تو وہی حال سُنا۔ حیران ہوا کہ کرنال کے معرکۂ جنگ میں کل تین ولایتی مریں اور بیس آدمی زخمی ہوں اور شہر میں میرا صد ہا سپاہی اس طرح ضایع ہو جائے! دُنیا آنکھوں میں اندھیر معلوم ہونے لگی۔ اسی وقت نکلا اور گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کو دیکھتا ہوا چلا کہ شاید مجھے زندہ وسلامت دیکھ کر یہ طوفان تھم جائے اور دہلی کے قتلِ عام کا دھبّا میرے نام پر نہ آئے۔ مگر شہر کے لوگوں نے اس پر بھی پتھر پھینکنے شروع کر دئے بلکہ بندوقیں بھی ماریں۔ یہاں تک کہ ایک مصاحب کا پہلو زخمی ہوا۔ ساتھ ہی دیکھا کہ جا بجا ایرانی غریب الوطنوں کے لاشے پڑے ہیں۔ یہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور قتلِ عام کا حکم دے کر کہہ دیا کہ جہاں تک کوئی قزلباش مرا ہوا نظر آئے ایک آدمی جیتا نہ رہے یہ کہہ کر تڑپولئے تک آیا اور روشن الدولہ کی مسجد[۵۱] میں آکر قتلِ عام کی علامت ظاہر کی یعنی تلوار کھینچ کر مسجد میں بیٹھ گیا۔ کوچوں میں خون کے نالے بہ گئے اور گھروں میں آگ لگ کر زمین سے آسمان تک دھواں دھار ہو گیا۔ نادر شاہ کا

---

۵۱ یعنی سنہری مسجد۔

غصہ خدا کا قہر۔ بادشاہ اور امیر سب دیکھتے تھے اور دم نہ مار سکتے تھے
ایک بڈھا خواجہ سرا محمد شاہ کے پاس روتا ہوا آیا اور کہا کہ حضور کے باپ
دادا کی رعیت سب قتل ہو گئی بادشاہ بھی آبدیدہ ہوئے اور اتنا کہا کہ ؎

دیدۂ عبرت کشا قدرت حق را ببیں ۔۔۔ شامت اعمال ما صورت نادر گرفت

دوپہر کے قریب جب عالم میں کہرام مچ گیا تو پھر سب نے آصف جاہ
سے رجوع کی۔ وہ تلوار گلے میں ڈالے سر برہنہ کئے خاموش نادر کے
سامنے جا کھڑا ہوا اور رونے لگا۔ نادر شاہ کے دل میں بھی خدا نے
رحم ڈالا۔ پوچھا کہ چہ می خواہی؟ اُس نے یہ شعر پڑھا ؎

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی ۔۔۔ مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

نادر نے شرما کر سر جھکا لیا۔ تلوار میان میں کی اور کہا کہ بہ ریش سفیدت
بخشیدم۔ اسی وقت شہر میں ایرانی نقیب اور چاوش امان امان کہتے
ہوئے دوڑے اور پل کے پل میں امن ہو گیا۔ سلطنت کے کاروبار
کے ساتھ دونوں بادشاہوں کی صحبتیں پھر بدستور جاری ہو گئیں۔
ایک دن بادشاہ نے نادر کی دعوت کی۔ ایک ایک خدمت ایک
ایک امیر کے سپرد ہوئی۔ کھانے کے بعد جب چائے آئی عمدۃ الملک
نے پیالی چائے کی بھری مگر جب دینے لگا تو سوچا کہ اگر پہلے اپنے آقا کو

دوں تو ادھر نادر ہے ایسا نہ ہو ابھی سر اڑا دے اور اگر نادر کو پہلے
دوں تو آئندہ بھی اپنے دربار میں منہ دکھانا ہے۔ یہاں اس کی تیزئ
طبع کا جوہر کام آیا۔ یعنی محمد شاہ کے سامنے پیالی کر کے کہا کہ "شاہان بشاہان
مید ہند"۔ یعنی فدوی کی لیاقت نہیں کہ اس عالیجاہ بادشاہ کو چائے دے۔
آپ اپنے دست مبارک سے دیجئے۔ چنانچہ دونوں بادشاہ خوش ہوئے اور
دونوں کے اہل دربار نے اس انداز خوشنما پر تحسین و آفریں کی۔

لطیفہ۔ ایک دن نادر شاہ کو پیٹ میں گرانی معلوم ہوئی۔ محمد شاہ
سے حال بیان کیا۔ اسی وقت علوی خاں حکیم آیا اور نبض دیکھ کر دوا خانے
کے داروغہ کو اشارہ کیا۔ چنانچہ کشتی مرصع پر زرنگار خوان پوش پڑا ہوا آیا۔
خوان پوش اٹھایا تو ایک مرصع مرتبان میں گلقند۔ الماس کا چمچہ برابر دھرا
گنگا جمنی کانٹا رتی ماشے سمیت وزن کے اندازے کے لئے ساتھ موجود تھا
اور حکیم سوچتا تھا کہ کس قدر گلقند اس میں سے نکالے اور وزن کر کے
کھانے کو دے۔ نادر شاہ نے خود مرتبان کو اٹھا لیا اور کھول کر دیکھا۔
بعد اس کے دو انگلیاں اندر ڈال کر چار نوالوں میں مرتبان خالی کر دیا۔
چونکہ اس میں خوشبودار دوائیں بھی ملی ہوئی تھیں اچھا معلوم ہوا اور کہا
کہ "حلوائے خوب است دیگر بیارید"۔

لطیفہ۔ ایک دن نادر شاہ ہوا کھانے کو سوار ہوا۔ محمد شاہ نے کہا

کہ ایران میں ہاتھی نہیں ہوتا۔ آج انھیں ہاتھی پر سوار کر وجب ہووج
میں جاکر بیٹھا تو آگے فیلبان کو دیکھا۔ پوچھا "ایں کیست؟" لوگوں نے کہا کہ
فیلبان است۔ ایں رامی راند۔ فیلبان سے کہا کہ عنانش بمن بدہ۔ اس نے
عرض کی کہ قبلۂ عالم فیل عنان ندارد۔ بہ اشارۂ سر بایم راہ می رود۔ ناک چڑھا کر
بولا۔ بنشانید کہ فرائیم[۵] مرکبے کہ عنانش بدست غیر باشد سواری را نشاید۔
لطیفہ محمد شاہ کے اہل نشاط میں ایک کنچنی تھی۔ نور بائی اس کا نام
تھا اور ناچ گانے کے علاوہ حاضر جوابی اور لطیفہ گوئی کا یہ عالم تھا کہ گویا
مُنہ سے پھول جھڑتے تھے۔ ایک دن نادر شاہ نے بھی اس کا گانا سُنا۔
چنانچہ بہت محظوظ ہوئے کچھ انعام دیا اور کہا کہ نور بائی روئے ہند را سیاہ
کن۔ بیا کہ با یرانت بریم۔ یہ سنتے ہی بائی جی کا دم بند ہوگیا اور ساری
لطیفہ گوئیاں بھول گئیں۔ دل میں ڈریں کہ خوش ہوکر ساتھ لے چلا ہے
اگر ذرا خفا ہوا تو خدا جانے ناک کاٹ لے۔ آنکھ نکال لے یا پیٹ چاک کروائے
غرض اسی وقت یہ غزل گائی

من شمع جاں گدازم تو صبح دلکشائی — سوزم گرت نہ بینم میرم چو رخ نمائی
نزدیکت ایں چنینم دور آں چنانکہ گفتم — نے تاب وصل دارم نہ طاقت جدائی

نادر شاہ بہت خوش ہوا اور اسکا مطلب سمجھکر اپنے ارادے سے درگذرا

---

[۵] فرود آئیم کا مخفف ہے یعنی ہاتھی کو بٹھا دو کہ ہم اُتر آئیں۔

اسی عرصے میں نصراللہ میرزا نے اپنے بیٹے کی ایک شاہزادی سے شادی کی۔
دو مہینے وہاں رہ کر خاطر خواہ نقد و جنس اور جواہر جس قدر سمیٹ سکا یہاں تک
کہ تخت طاؤس تک بھی اُٹھالیا اور سونے چاندی کے چکّی کے پاٹ ڈھلوا کر
اونٹوں پر لدوا دئے۔ غرض کل تیس کروڑ روپئے کا اثاثہ لے کر روانہ ہوا
اور ڈیرہ جات کابل اور پنجاب کے ان علاقوں کو جن کا روپیہ کابل کی فوج
میں لگا ہوا تھا۔ انھیں ہندوستان سے نکال کر ایران کی سلطنت میں
داخل کیا۔ محمد شاہ دولھا پھر یہاں رنگ رلیاں کرنے لگے اور چند سال
کے بعد اسی عیش و عشرت سے تین برس سلطنت کر کے عالم بقا کو روانہ
ہوئے۔
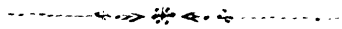
سرسید احمد خاں

پیدائش دہلی ۱۸۱۷ء | وفات علیگڈھ ۱۸۹۸ء

سرسید احمد خاں کے بزرگ شاہانِ مغلیہ کے متوسلین میں سے تھے اور اوائل عمر میں خاندانی توسل کے لحاظ سے ان کو بھی اسی دربار سے تعلق تھا لیکن بہ مقتضائے زمانہ شناسی جو آپ کے دماغ کا خاص جوہر تھا سرسید احمد خاں عربی فارسی کی تعلیم اس زمانہ کے دستور کے مطابق حاصل کرکے ۱۸۳۷ء میں سرکار انگریزی کی ملازمت میں داخل ہوئے اور رفتہ رفتہ ترقی کرکے سب ججی کے اعلیٰ عہدے تک پہونچے۔ ان کی اوّل تصنیف آثار الصنادید ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کا طرز تحریر پرانے ڈھنگ کا ہے اور اس میں دہلی کی عمارات اور مشاہیر کا مفصل حال لکھا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے زمانہ میں سرسید احمد خاں کے قدم جادۂ وفاداری و خیرخواہی سے نہیں ڈگے اور اُنھوں نے اپنی جان خطرہ میں ڈال کر بجنور کے انگریز حکام کی جان بچائی۔ غدر فرو ہونے کے بعد سرسید احمد خاں نے اپنی ساری توجہ مسلمانوں کی تعلیم اور اُن کی سوشل اصلاح کی طرف مبذول

کی اور اس مدعا کے حاصل کرنے کے لئے پہلے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا اور پھر ۱۸۷۵ء میں علیگڈھ کالج کی بنا ڈالی۔ منشا یہ تھا کہ ان کے وسیلہ سے مسلمانوں کے دلوں کو نئی روشنی کے نور سے منور کر کے ان میں تہذیب جدید کے اصولوں کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت میں جو بیّن تغیر پچھلے تیس برس میں واقع ہوا ہے وہ اس بات کا شاہد ہے کہ سر سیّد احمد خاں کو اپنی کوشش میں کہاں تک کامیابی ہوئی۔

ذیل کے مضامین تہذیب الاخلاق کی مختلف جلدوں سے اخذ کئے گئے ہیں۔

رسم و رواج

ماخوذ از تہذیب الاخلاق

جو لوگ کہ حسن معاشرت اور تہذیب الاخلاق و شائستگی عادات پر بحث کرتے ہیں اُن کے لئے کسی ملک یا قوم کے کسی رسم و رواج کو اچھا اور کسی کو

بُرا ٹھہرانا نہایت مشکل کام ہے ہر ایک قوم اپنے ملک کے رسم و رواج کو پسند کرتی ہے اور اُسی میں خوش رہتی ہے کیونکہ جن باتوں کی چھٹ پن سے عادت اور موانست ہو جاتی ہے وہی دل کو بھلی معلوم ہوتی ہیں لیکن اگر ہم اسی پر اکتفا کریں تو اس کے معنی یہ ہو جاویں گے کہ بھلائی اور برائی حقیقت میں کوئی چیز نہیں ہے بلکہ صرف عادت پر موقوف ہے جس چیز کا رواج ہو گیا عادت پڑ گئی وہی اچھی ہے اور جس چیز کا رواج نہ ہو اور عادت نہ پڑی وہی بُری ہے مگر یہ بات صحیح نہیں۔ بھلائی اور برائی فی نفسہ مستقل چیز ہے۔ رسم و رواج سے البتہ یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ کوئی اُس کے کرنے پر نام نہیں دھرتا۔ عیب نہیں لگاتا کیونکہ سب کے سب اُس کو کرتے ہیں مگر ایسا کرنے سے وہ چیز اگر فی نفسہ بُری ہے تو اچھی نہیں ہو جاتی پس ہم کو صرف اپنے ملک یا اپنی قوم کے رسومات کے اچھے ہونے پر بھروسہ نہ کر لینا چاہیئے تاکہ اگر ہم میں کوئی ایسی بات جو حقیقت میں بد ہو اور بسبب رسم و رواج کے ہم کو اُس کی بدی خیال میں نہ آتی ہو تو معلوم ہو جاوے اور وہ بدی ہمارے ملک یا قوم سے جاتی رہے۔ البتہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ہر گاہ معیوب اور غیر معیوب ہونا کسی بات کا زیادہ تر اُس کے رواج و عدم رواج پر منحصر ہو گیا ہے تو ہم کس طرح کسی امر کے رسم و رواج کو اچھا یا بُرا قرار دے سکیں گے

بلاشبہ یہ بات کسی قدر مشکل ہے مگر جبکہ یہ تسلیم کر لیا جاوے کہ بھلائی یا بُرائی
فی نفسہ بھی کوئی چیز ہے تو ضرور ہر بات کی فی الحقیقت بھلائی یا بُرائی
قرار دینے کے لئے کوئی نہ کوئی طریقہ ہوگا۔ پس ہم کو اس طریقہ کے
تلاش کرنے اور اُسی کے مطابق اپنی رسوم و عادات کی بھلائی یا بُرائی
قرار دینے کی پیروی کرنی چاہئے۔ سب سے مقدم اور سب سے ضروری
امر اس کام کے لئے یہ ہے کہ ہم اپنے دل کو تعصبات سے اور ان تاریک
خیالوں سے جو انسان کو سچی بات کے سُننے اور کرنے سے روکتے ہیں
خالی کریں اور اُس دلی نیکی سے جو خدا تعالیٰ نے انسان کے دل میں
رکھی ہے ہر ایک بات کی بھلائی یا بُرائی دریافت کرنے پر متوجہ ہوں
یہ بات ہم کو اپنی قوم اور اپنے ملک اور دوسری قوم اور دوسرے ملک
دونوں کے رسم و رواج کے ساتھ برتنی چاہئے تا کہ جو رسم و عادت
ہم میں بھلی ہے اُس پر مستحکم رہیں اور جو ہم میں بُری ہے اُس کے
چھوڑنے پر کوشش کریں اور جو رسم و عادت دوسروں میں اچھی ہے
اُسکو بلا تعصب اختیار کریں اور جو اُن میں بُری ہے اُس کے اختیار
کرنے سے بچتے رہیں۔ جبکہ ہم غور کرتے ہیں کہ تمام دنیا کی قوموں میں
جو رسوم و عادات مروج ہیں اُنھوں نے کس طرح اُن قوموں
میں رواج پایا ہے تو باوجود مختلف ہونے اُن رسومات و عادات

اِس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ جو عادتیں اور رسمیں قوموں میں مروّج ہیں اُنکا رواج یا تو مُلک کی آب و ہوا کی خاصیت سے ہوا ہے یا اُن اتفاقیہ امور سے جن کی ضرورت وقتاً فوقتاً بضرورت تمدّن و معاشرت کے پیش آتی گئی ہے یا دوسرے قوم کی تقلید و اختلاط سے مروج ہو گئی ہیں یا انسان کی حالت ترقی یا تنزل نے اُس کو پیدا کر دیا ہے۔ پس ظاہرا یہی چار سبب ہر ایک قوم اور ہر ایک ملک میں رسوم و عادات کے مروج ہونے کا مبدا و منشا معلوم ہوتے ہیں۔

جو رسوم و عادات کہ بمقتضائے آب و ہوا کسی ملک میں رائج ہوئی ہیں اُن کے صحیح اور درست ہونے میں کچھ شبہ نہیں کیونکہ وہ عادتیں قدرت اور فطرت نے اُن کو سکھلائی ہیں جس کے بیج ہونے میں کچھ شبہ نہیں مگر صرف اُن کے برتاؤ کا طریقہ غور طلب باقی رہتا ہے۔ مثلاً ہم یہ بات دیکھتے ہیں کہ کشمیر میں اور لندن میں سردی کے سبب انسان کو آگ سے گرم ہونے کی ضرورت ہے پس آگ کا استعمال ایک نہایت سچی اور صحیح عادت دونوں ملکوں کی قوموں میں ہے مگر اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ آگ کے استعمال کے لئے یہ بات بہتر ہے کہ مکانات میں ہندسی قواعد سے آتش خانہ بنا کر آگ کی گرمی سے فائدہ اُٹھاویں یا مٹی کی کانگڑیوں میں آگ جلا کر گردن میں لٹکائے پھریں جس سے گورا گورا پیٹ اور سینہ

کالا اور بھونڈا ہو جاوے۔

طریق تمدن و معاشرت روز بروز انسانوں میں ترقی پاتا ہے اور اس لئے ضرور ہے کہ ہماری رسمیں و عادتیں جو بضرورت تمدن و معاشرت مروج ہوئی تھیں اُن میں بھی روز بروز ترقی ہوتی جاوے اور اگر ہم اپنی اُن پہلی ہی رسموں اور عادتوں کے پابند رہیں اور کچھ ترقی نہ کریں تو بلاشبہ بمقابل اُن قوموں کے جنھوں نے ترقی کی ہے ہم ذلیل اور خوار ہوں گے اور مثل جانوروں کے خیال کئے جاویں گے پھر خواہ اس نام سے ہم بُرا مانیں یا نہ مانیں۔ انصاف کا مقام ہے کہ جب ہم اپنے سے کمتر اور ناتربیت یافتہ قوموں کو ذلیل و حقیر مثل جانوروں کے خیال کرتے ہیں تو جو قومیں کہ ہم سے زیادہ شایستہ و تربیت یافتہ ہیں اگر وہ بھی ہم کو اُسی طرح حقیر و ذلیل مثل جانوروں کے سمجھیں تو ہم کو کیا مقام شکایت ہے۔ ہاں اگر ہم کو غیرت ہے تو ہم کو اس حالت سے نکلنا اور اپنی قوم کو نکالنا چاہئیے۔ دوسری قوموں کی رسومات کا اختیار کرنا اگرچہ بے تعصبی اور دانائی کی دلیل ہے مگر جب وہ رسمیں اندھے پنے سے صرف تقلیداً بغیر سمجھے بوجھے اختیار کی جاتی ہیں تو کافی ثبوت نادانی اور حماقت کا ہوتی ہیں۔ دوسری قوموں کی رسومات اختیار کرنے میں اگر ہم دانائی اور ہوشیاری سے کام کریں تو اُس قوم سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں

اس لئے کہ ہم کو اُس رسم سے تو موانست نہیں ہوتی اور اس سبب سے اس کی حقیقی بھلائی یا بُرائی پر غور کرنے کا بشرطیکہ ہم تعصب کو کام میں نہ لاویں بہت اچھا موقع ملتا ہے اُس قوم کے حالات دیکھنے سے جس میں وہ رسمیں جاری ہیں ہم کو بہت عمدہ مثالیں سیکڑوں برس کے تجربہ کی ملتی ہیں جو اُس رسم کے اچھے یا بُرے ہونے کا قطعی تصفیہ کر دیتی ہیں۔ مگر یہ بات اکثر جگہ موجود ہے کہ ایک قوم کی رسمیں دوسری قوم میں بسبب اختلاط اور ملاپ کے اور بغیر قصد و ارادہ کے اور اُن کی بھلائی اور بُرائی پر غور و فکر کرنے کے بغیر داخل ہو گئے ہیں جیسے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا بالتخصیص حال ہے کہ تمام معاملات زندگی بلکہ بعض امورات مذہبی میں بھی ہزاروں رسمیں غیر قوموں کی بلا غور و فکر اختیار کر لی ہیں۔ یا کوئی نئی رسم مشابہ اُس قوم کی رسم کے ایجاد کر لی ہے مگر جب ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے طریق معاشرت اور تمدن کو اعلیٰ درجہ کی تہذیب پر پہونچادیں تاکہ جو قومیں ہم سے زیادہ مہذب ہیں وہ ہم کو بہ نظر حقارت نہ دیکھیں تو ہمارا فرض ہے کہ اپنی تمام رسوم و عادات کو بنظر تحقیق دیکھیں اور جو بُری ہوں اُن کو چھوڑیں اور جو قابل اصلاح ہوں ان میں اصلاح کریں۔

جو رسومات کہ بسبب حالت ترقی یا تنزل کسی قوم کے پیدا ہوتی

ہیں وہ رسمیں ٹھیک اُس قوم کی ترقی اور تنزل یا عزت اور ذلت کی نشانی ہوتی ہیں۔ اس مقام پر ہم نے لفظ ترقی یا تنزل کو نہایت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے اور تمام قسم کے حالات ترقی یا تنزل مراد لئے ہیں خواہ وہ ترقی و تنزل اخلاق سے متعلق ہو۔ خواہ علوم و فنون اور طریق معاشرت و تمدن سے اور خواہ ملک و دولت و جاہ و حشمت سے۔ بلاشبہہ یہ بات تسلیم کرنے کے قابل ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں نکلنے کی جس کی تمام رسمیں اور عادتیں عیب اور نقصان سے خالی ہوں مگر اتنا فرق بے شک ہے کہ بعضی قوموں میں ایسی رسومات اور عادات جو درحقیقت نفس الامر میں بُری ہوں کم ہیں اور بعض میں زیادہ اور اسی وجہ سے وہ پہلی قوم پچھلی قوم سے اعلیٰ اور معزز ہے اور بعضی ایسی بھی قومیں ہیں جنہوں نے انسان کی حالت ترقی کو نہایت اعلیٰ درجہ تک پہونچایا ہے اور اس حالت انسانی کی ترقی نے اُن کے نقصان کو چھپا لیا ہے جیسے ایک نہایت عمدہ و نفیس شیریں دریا تھوڑے سے گدلے اور کھاری پانی کو چھپا لیتا ہے یا ایک نہایت لطیف شربت کا بھرا ہوا پیالہ نیبو کی کھٹی دو بوندوں سے زیادہ تر لطیف اور خوشگوار ہو جاتا ہے اور یہی قومیں ہیں جو اب دنیا میں سویلیزڈ مہذب گنی جاتی ہیں اور درحقیقت اس لقب کی مستحق بھی ہیں۔

خوشامد

دل کی جس قدر بیماریاں ہیں اُن میں سب سے زیادہ مہلک خوشامد کا اچھّا لگنا ہے جس وقت کہ انسان کے بدن میں ایسا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے جو وبائی ہوا کے اثر کو جلد قبول کر لیتا ہے تو اُسی وقت انسان مرض مہلک میں گرفتار ہو جاتا ہے اسی طرح جبکہ خوشامد کے اچھا لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے تو اُس کے دل میں ایک ایسا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے جو ہمیشہ زہریلی باتوں کے زہر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے جسطرح کہ خوش گلو گانیوالے کی آواز اور خوش آیند باجے کی آواز انسان کے دل کو نرم کر دیتی ہے اسیطرح خوشامد بھی انسان کے دل کو ایسا پگھلا دیتی ہے کہ ہر ایک کانٹے کے چبھنے کی جگہہ اُس میں ہو جاتی ہے۔ اوّل اوّل یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی آپ خوشامد کرتے ہیں اور اپنی ہر ایک چیز کو اچھا سمجھتے ہیں اور آپ ہی آپ خوشامد کر کر اپنے دل کو خوش کرتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ اوروں کی خوشامد ہم میں اثر کرنے لگتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اوّل تو خود ہم کو اپنی محبت پیدا ہوتی ہے پھر یہی محبت ہم سے باغی ہو جاتی ہے اور ہمارے بیرونی دشمنوں سے جا ملتی ہے اور جو محبّت و مہربانی ہم خود اپنے ساتھ کرتے تھے وہ ہم خوشامدیوں کے ساتھ کرنے لگتے ہیں اور وہی ہماری محبت ہم کو

یہ تبلاتی ہے کہ اُن خوشامدیوں پر مہربانی کرنا نہایت حق اور انصاف
ہے جو ہماری باتوں کو ایسا سمجھتے ہیں اور اُن کی اس قدر قدر کرتے
ہیں جبکہ ہمارا دل ایسا نرم ہو جاتا ہے اور اس قسم کے پھُسلاوے اور
فریب میں آجاتا ہے تو ہماری عقل خوشامدیوں کے مکر و فریب سے اندھی
ہو جاتی ہے اور وہ مکر و فریب ہماری بیمار طبیعت پر بالکل غالب آجاتا
ہے۔ لیکن اگر ہر شخص کو یہ بات معلوم ہو جاوے کہ خوشامد کا شوق کیسے
نالائق اور کمینہ سببوں سے پیدا ہوتا ہے تو یقینی خوشامد کی خواہش کرنیوالا
شخص بھی ویسا ہی نالائق اور کمینہ متصوّر ہونے لگے گا جبکہ ہم کو کسی ایسے
وصف کا شوق پیدا ہوتا ہے جو ہم میں نہیں ہے یا ہم ایسے بنا چاہتے
ہیں جیسے کہ درحقیقت ہم نہیں ہیں تب ہم اپنے تئیں خوشامدیوں کے
حوالہ کرتے ہیں جو اوروں کے اوصاف اور اوروں کی خوبیاں ہم میں
لگانے لگتے ہیں۔ گو بسبب اُس کمینہ شوق کے اُس خوشامدی کی باتیں
ہم کو اچھی لگتی ہوں مگر درحقیقت وہ ہم کو ایسی ہی بدزیب ہیں جیسے کہ دوسرے
کے کپڑے جو ہمارے بدن پر کسی طرح ٹھیک نہیں۔ اس بات سے کہ ہم اپنی
حقیقت کو چھوڑ کر دوسرے کے اوصاف اپنے میں سمجھنے لگیں۔ یہ بات
نہایت عمدہ ہے کہ ہم اپنی حقیقت کو درست کریں اور سچ مچ وہ اوصاف
خود اپنے میں پیدا کریں اور بعوض جھوٹی نقل بننے کے خود ایک اچھی

اصل ہو جاویں کیونکہ ہر قسم کی طبیعتیں جو انسان رکھتے ہیں اپنے اپنے موقع پر مفید ہوسکتی ہیں۔ ایک تیز مزاج اور چست چالاک آدمی اپنے موقع پر ایسا ہی مفید ہوتا ہے جیسے کہ ایک رونی صورت کا چُپ چاپ آدمی اپنے موقع پر۔

خودی جو انسان کو برباد کرنے کی چیز ہے جب چُپ چاپ سوئی ہوتی ہے تو خوشامد اُس کو جگاتی اور اُبھارتی ہے اور جس چیز کی خوشامد کی جاتی ہے اُس میں چھچھورے پن کی کافی لیاقت پیدا کردیتی ہے۔ مگر یہ بات بخوبی یاد رکھنی چاہئے کہ جس طرح خوشامد ایک بد تر چیز ہے اسیطرح مناسب اور سچی تعریف کرنا نہایت عمدہ اور بہت ہی خوب چیز ہے جسطرح کہ لائق شاعر دوسروں کی تعریف کرتے ہیں کہ اُن اشعار سے اُن لوگوں کا نام باقی رہتا ہے جن کی وہ تعریف کرتے ہیں اور شاعری کی خوبی سے خود اُن شاعروں کا نام بھی دنیا میں باقی رہتا ہے۔ دونوں شخص خوش ہوتے ہیں۔ ایک اپنی لیاقت کے سبب سے اور دوسرا اُس لیاقت کو تمیز کرنے کے سبب سے مگر لیاقت شاعری کی یہ ہے کہ وہ نہایت بڑے اُستاد مصوّر کی مانند ہو کہ وہ اصل صورت اور رنگ اور خال خط کو بھی قائم رکھتا ہے اور پھر بھی تصویر ایسی بناتا ہی کہ خوشنما معلوم ہو۔ ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اِس

بات کا خیال نہیں رکھتے بلکہ جس کی تعریف کرتے ہیں اس کے اوصاف
ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں جن کے سبب سے وہ تعریف تعریف
نہیں رہتی بلکہ فرضی خیالات ہو جاتے ہیں۔ ناموری کی مثال نہایت عمدہ
خوشبو کی ہے جب ہوشیاری اور سچائی سے ہماری واجب تعریف ہوتی ہے
تو اسکا ویسا ہی اثر ہوتا ہی جیسے عمدہ خوشبو کا مگر جب کسی کمزور دماغ میں زبردستی
سے وہ خوشبو ٹھونس دی جاتی ہے تو ایک تیز لو کی مانند دماغ کو پریشان
کر دیتی ہے۔ فیاض آدمی کو بدنامی اور نیکنامی کا زیادہ خیال ہوتا ہے اور
عالی ہمت طبیعت کو مناسب عزت اور تعریف سے ایسی ہی تقویت
ہوتی ہے جیسے کہ غفلت اور حقارت سے پست ہمتی ہوتی ہے۔ جو
لوگ کہ عوام کے درجہ سے اوپر ہیں انھیں لوگوں پر اس کا زیادہ اثر ہوتا
ہے جیسے کہ تھرمامیٹر میں وہی حصہ موسم کا زیادہ اثر قبول کرتا ہے جو
صاف اور سب سے اوپر ہوتا ہے۔

سولزیشن یا تہذیب

ہم دریافت کیا چاہتے ہیں کہ سولزیشن کیا چیز ہے اور کن کن چیزوں سے علاقہ رکھتی ہے۔ کیا کوئی بنائی ہوئی چیز ہے یا قدرت نے انسان کی فطرت میں اس کو پیدا کیا ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں کیا یہ کوئی اصطلاح ہے جس کو لوگوں نے یا فیلسوفوں نے مقرر کیا ہے۔ یا یہ ایسی چیز ہے کہ اس کا مفہوم اور جن جن چیزوں سے اس کا تعلق ہے قانون قدرت میں پایا جاتا ہے۔ اس امر کے تصفیہ کے لئے انسان کے حالات پر ہم کو نظر کرنی چاہیے اگر تہذیب انسانی میں ایک فطرتی چیز ہے تو وحشیوں میں شہریوں میں سب میں اس کا نشان ملے گا گو اُس کی صورتیں مختلف دکھائی دیتی ہوں الّا سب کی جڑ ایک ہی ہوگی۔ انسان میں ایک یہ فطرتی بات ہے کہ وہ اپنے خیال کے موافق کسی چیز کو پسند کرتا ہے اور کسی کو ناپسند یا یوں کہو کہ کسی چیز کو اچھّا ٹھہراتا ہے اور کسی چیز کو بُرا اور اُسکی طبیعت اس طرف مائل ہے کہ اُس بُری چیز کی حالت کو ایسی حالت سے تبدیل کرے جسکو وہ اچھّا سمجھتا ہے یہی چیز سولزیشن کی جڑ ہے جو انسان کے ہر گروہ میں اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے۔ اسی تبادلہ

کا نام سولزیشن یا تہذیب ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ یہ میلان یا یہ خواہش تبادلہ انسان میں قدرتی یا فطرتی ہے۔ سولزیشن یا تہذیب کی طرف انسان کی طبیعت کے مائل ہونیکے دو اصول ٹھہرے اچھا اور بُرا۔ اور برے کو اچھا کرنا سولزیشن یا تہذیب ٹھہری مگر اچھا اور بُرا قرار دینے کے مختلف اسباب خلقی اور خلقی ملکی اور تمدنی ایسے ہوتے ہیں جن کے سبب اچھا اور برا ٹھہرانے میں یا یوں کہو کہ قوموں کی سولزیشن میں اختلاف پڑ جاتا ہے ایک قوم جس بات کو اچھا سمجھتی ہے اور داخل تہذیب جانتی ہے دوسری قوم اُسی بات کو بہت بُرا اور وحشیانہ حرکت قرار دیتی ہے یہ اختلاف سولزیشن کا قوموں کے باہم ہوتا ہے۔ اشخاص میں نہیں ہوتا یا بہت ہی کم ہوتا ہے۔ جبکہ ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہہ اکٹھا ہو کر بستا ہے تو اکثر اُن کی ضرورتیں اور اُنکی حاجتیں۔ اُن کی غذائیں اور اُنکی پوشاکیں۔ ان کی معلومات اور اُنکے خیالات اُن کی مسرت کی باتیں اور ان کی نفرت کی چیزیں سب یکساں ہوتی ہیں اور اسی لئے بُرائی اور اچھائی کے خیالات بھی سب یکساں پیدا ہوتے ہیں اور بُرائی کو اچھائی سے تبدیل کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہے اور یہی مجموعی خواہش تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اس قوم یا گروہ کی سولزیشن ہے۔ مگر جبکہ مختلف گروہیں مختلف مقامات میں بستی ہیں تو اُن کی حاجتیں اور خواہشیں بھی مختلف

ہوتی ہیں اور اس سبب سے تہذیب کے خیالات بھی مختلف ہوتے ہیں
مگر ضرور کوئی ایسی چیز بھی ہوگی کہ جو سولزیشن کی ان مختلف حالتوں کا
تصفیہ کرسکے۔ ملکی حالتیں جہاں تک کہ وہ بود و باش سے تعلق رکھتی ہیں
نہ فکر اور خیال اور دماغ سے اُن کو تہذیب سے چنداں تعلق نہیں بلکہ
صرف انسان کے خیال کو اُس سے تعلق ہے جس کے سبب وہ اچھا اور
بُرا ٹھہراتا ہے اور جس باعث سے خواہش تبادلہ تحریک میں آتی ہے اور
وہ تبادلہ واقع ہوتا ہے جو سولزیشن کہلاتا ہے۔ پس سولزیشن کی مُختلف
حالتوں کا فیصلہ وہ اسباب کر سکتے ہیں جن کے سبب سے اچھے اور
بُرے کا خیال دل میں بیٹھا ہے۔ اچھے اور بُرے کی جگہ میں اور لفظ کا استعمال
کروں گا یعنی پسند اور ناپسند۔ انگریزی میں ایک لفظ ٹیسٹ ہے جو
نہایت وسیع معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ ہماری زبان میں بھی اُس قسم
کے لفظ ہیں جیسے کہ مزا یا مذاق۔ مگر وہ استعمال میں ایسے خاص ہوگئے
ہیں کہ اُن سے وہ عام اور وسیع معنی خیال میں نہیں آتے۔ اسواسطے
میں اُس لفظ کا ترجمہ "پسند" کرتا ہوں۔ پس پسند کا صحیح ہونا جو خیال
کے صحیح ہونے کی فرع ہے۔ بہت بڑا وسیلہ سولزیشن کی مختلف حالتوں کے
تصفیہ کا ہے۔ خیال کی درستی اور پسند کی صحت کثرت معلومات پر اور علم
طبیعات سے بخوبی ماہر ہونے پر منحصر ہے۔ انسان کی معلومات کو

روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے اور اُس کے ساتھ ساتھ سولزیشن بھی بڑھتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ آیندہ کوئی ایسا زمانہ آوے کہ انسان کی تہذیب میں ایسی ترقی ہو کہ اس زمانہ کی تہذیب کو بھی وہ ایسے ہی ٹھنڈے دل سے دیکھیں جیسے کہ ہم اپنے سے اگلوں کی تہذیب کو ایک ٹھنڈے مگر موذب دل سے دیکھتے ہیں۔ تہذیب یا یوں کہو کہ بُری حالت سے اچھی حالت میں لانا دُنیا کی تمام چیزوں سے اخلاقی ہوں یا مادّی یکساں تعلق رکھتا ہے اور تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ تکلیف سے بچنے اور آسائش حاصل کرنیکا سب کو یکساں خیال ہے۔ ہنر اور اُسکو ترقی دینا تمام دنیا کی قوموں میں موجود ہے۔ ایک تربیت یافتہ قوم زرو جواہر۔ یاقوت والماس سے نہایت نفیس خوبصورت زیور بناتی ہے۔ ناتربیت یافتہ قوم بھی کوڑیوں اور گھونگھوں سے اپنی آرائش کا سامان بہم پہونچاتی ہے۔ تربیت یافتہ قومیں اپنی آرایش میں سونے چاندی مونگے اور موتیوں کو کام میں لاتی ہیں۔ ناتربیت یافتہ قومیں جانوروں کے خوبصورت اور رنگین پروں کو۔تیلیوں پر سے چھلے ہوئے سُنہرے پوست اور زمرد کی سی رنگ کی باریک اور خوشنما گھانس میں گوندھ کر اپنے تئیں آراستہ کرتی ہیں۔ تربیت یافتہ قوموں کو بھی اپنے لباس کی درستی کا خیال ہے۔ ناتربیت یافتہ قومیں بھی اُس کی درستی پر مصروف

ہیں۔ شاہی مکانات نہایت عمدہ اور عالیشان بنتے ہیں اور نفیس چیزوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ناتربیت یافتہ قوموں کے جھونپڑے اور اُن کے رہنے کے گھونسلے درختوں پر باندھے ہوئے ٹانڈ۔ زمین میں کُھدی ہوئی کھوئیں بھی تہذیب سے خالی نہیں۔ معاشرت کی چیزیں۔ تمدّن کے قاعدے۔ عیش وعشرت کی مجلس۔ خاطر اور مدارات کے کام اور اخلاق و محبّت کی علامتیں۔ دونوں میں پائی جاتی ہیں۔ علمی خیالات سے بھی ناتربیت یافتہ قومیں خالی نہیں بلکہ بعضی چیزیں اُن میں زیادہ اصلی اور قدرتی طور سے دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً شاعری جو ایک نہایت عمدہ فن تربیت یافتہ قوموں میں ہے۔ ناتربیت یافتہ قوموں میں عجب عمدگی وخوبی سے پایا جاتا ہے۔ یہاں خیالی باتوں کو ادا کیا جاتا ہے اور وہاں دلی جوشوں اور اندرونی جذبوں کا اظہار ہوتا ہے۔ موسیقی نے تربیت یافتہ قوموں میں نہایت ترقی پائی ہے مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں بھی عجیب کیفیت دکھائی ہے۔ ان کی ادا اور آواز کی پھرت۔ اُسکا گھٹاؤ اور اُس کا بڑھاؤ۔ اُس کا ٹھہراؤ اور اُس کی اونچ۔ ہاتھوں کا بھاؤ اور پاؤں کی دھمک زیادہ تر مصنوعی قواعد کی پابند ہے مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں یہ سب چیزیں دلی جوش کی موجیں ہیں۔ وہ لے اور تال۔ راگ وراگنی کو نہیں جانتے مگر دل کی لہر اُن کی لے اور دل کی بھڑک اُنکا

تال ہے۔ اُن کا غول باندھ کر کھڑا ہونا۔ طبعی حرکت کے ساتھ اچھلنا۔ دِل کی بیتابی سے جھکنا اور پھر جوش میں آکر سیدھا ہو جانا گو نزاکت اور فن غنیا گری سے خالی ہو مگر قدرتی جذبوں کی ضرور تصویر ہے۔ دِلی جذبوں کا روکنا اور اُن کو عمدہ حالت میں رکھنا۔ تمام قوموں کے خیالات میں شامل ہے۔ پس جس طرح کہ ہم تہذیب کا قدرتی لگاؤ تمام انسانوں میں پاتے ہیں اسی طرح اُس کا تعلق اصلی اور مادی چیزوں میں دیکھتے ہیں جس چیز میں کہ ترقی یعنی بُرائی سے اچھائی کی طرف رجوع یا ادنیٰ درجہ کی طرف تحریک ہو سکتی ہے اُسی سے تہذیب بھی متعلق ہے۔ پس سولزیشن یا تہذیب کیا ہے؟ انسان کے افعال ارادی اور جذبات نفسانی کو اعتدال پر رکھنا۔ وقت کو عزیز سمجھنا۔ واقعات کے اسباب کو ڈھونڈنا اور ان کو ایک سلسلہ میں لانا۔ اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور طریق تمدن اور علوم و فنون کو بقدر امکان قدرتی خوبی اور فطرتی عمدگی پر پہونچانا اور اُن سب کو خوش اسلوبی سے برتنا اور اُس کا نتیجہ کیا ہے۔ روحانی خوشی اور جسمانی خوبی اور اصلی تمکین اور حقیقی وقار اور خود اپنی عزت کی عزت اور درحقیقت یہی پچھلی ایک بات ہے جس سے وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز ہوتی ہے۔ اس تہذیب کے حاصل ہونے کے بقول مسٹر اتیچ۔ ٹی بکل صاحب کے چار اصول ہیں۔ اوّل، جو چیزیں ہم کو دکھائی دیتی ہیں اور

جن کا سبب ہم کو معلوم نہیں ہوتا۔ اُن کے سببوں اور قاعدوں کو دریافت کرنا اور اُن کے علوم کو پھیلانا پس جس قدر کامیابی اس میں ہوگی اُسی قدر انسان کی ترقی ہوگی"۔ دوم "اس تحقیقات سے پہلے تجسس کا خیال پیدا ہونا چاہیے جس سے ابتدا میں تحقیقات کو مدد ملتی ہے اور بعد کو تحقیقات سے اُس کی استعانت ہوتی ہے"۔ سوم "جو باتیں اس طرح دریافت ہوتی ہیں وہ عقلی باتوں کے اثر کو زیادہ کرتی ہیں اور اخلاق کی باتوں کو کسی قدر کم مگر اخلاق کی باتیں بہ نسبت عقلی باتوں کے زیادہ مستقل ہیں اور ان میں کمی بیشی بہت کم ہوتی ہے"۔ چہارم۔ اس تحریک کا بڑا دشمن جو درحقیقت سولزیشن کا بھی سخت دشمن ہے۔ یہ خیال ہے کہ جب تک زندگی کے امورات کی نگرانی ہر طرح پر سلطنت اور مذہب سے نہ ہو۔ تب تک انسان کے گروہ کی ترقی نہیں ہو سکتی یعنی سلطنت رعایا کو سکھلاوے کہ اُن کو کیا کرنا چاہیے اور مذہب یہ سکھلاوے کہ کس بات پر یقین کرنا چاہیے"۔

اپنی مدد آپ

خدا اُن کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں۔

یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ مقولہ ہے اس چھوٹے سے فقرہ میں انسانوں کا اور نسلوں کا تجربہ جمع ہے۔ ایک شخص میں اپنے آپ مدد کرنے کا جوش اُس کی سچی ترقّی کی بنیاد ہے، اور جبکہ یہ جوش بہت سے شخصوں میں پایا جاوے تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت اور قومی مضبوطی کی جڑ ہے جبکہ کسی شخص کے لئے یا کسی گروہ کے لئے کوئی دوسرا کچھ کرتا ہے تو اُس شخص میں سے یا اُس گروہ میں سے وہ جوش اپنی آپ مدد کرنیکا کم ہو جاتا ہے، اور ضرورت اپنی آپ مدد کرنے کی اُسکے دل سے مٹتی جاتی ہے، اور اُسی کے ساتھ غیرت جو ایک نہایت عمدہ قوت انسان میں ہے اور اُسی کے ساتھ عزّت جو اصلی چمک دمک انسان کی ہے از خود جاتی رہتی ہے، اور جبکہ ایک قوم کی قوم کا یہ حال ہو تو وہ ساری قوم دوسری قوموں کی آنکھ میں ذلیل اور بے غیرت اور بے عزّت ہو جاتی ہے۔ آدمی جس قدر دوسرے پر بھروسہ کرتے جاتے ہیں۔ خواہ اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کا بھروسہ گورنمنٹ ہی پر

کیوں نہ کریں یہ امر بدیہی اور لابدی ہے کہ وہ اسی قدر بے مدد اور بے عزت ہوتے جاتے ہیں۔ اے میرے ہموطن بھائیو! کیا تمہارا یہی حال نہیں ہے؟

ایشیا کی تمام قومیں یہی سمجھتی رہی ہیں کہ اچھا بادشاہ ہی رعایا کی ترقی اور خوشی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یورپ کے لوگ جو ایشیاء کے لوگوں سے زیادہ ترقی کر گئے تھے۔ یہ سمجھتے تھے ایک عمدہ انتظام قوم کی عزت و بھلائی و خوشی اور ترقی کا ذریعہ ہے۔ خواہ وہ انتظام باہمی قوم کے رسم و رواج کا ہو یا گورنمنٹ کا۔ اور یہی سبب ہے کہ یورپ کے لوگ قانون بنانے والی مجلسوں کو بہت بڑا ذریعہ انسان کی ترقی و بہبودی کا خیال کر کے اُن کا درجہ سب سے اعلیٰ اور نہایت بیش بہا سمجھتے تھے مگر حقیقت میں سب خیال غلط ہیں۔ ایک شخص فرض کرو کہ وہ لندن میں آئرلینڈ کی طرف سے پارلیمنٹ کا ممبر ہی کیوں نہ ہو جائے یا کلکتہ میں ویسرائے اور گورنر جنرل کی کونسل میں ہندوستان کا ممبر ہی ہو کر کیوں نہ بیٹھ جاوے۔ قومی عزت اور قومی بھلائی کی ترقی کیا کر سکتا ہے۔ برس دو برس میں کسی بات پر ووٹ دینے سے گو وہ کیسی ہی ایمانداری اور انصاف سے کیوں نہ دیا ہو۔ قوم کی کیا بھلائی ہو سکتی ہے بلکہ خود اُس کے چال چلن پر اُس کے برتاؤ پر بھی اُس سے کوئی اثر پیدا نہیں ہوتا تو قوم کے برتاؤ پر کیا اثر پیدا کر سکتا ہے۔ ہاں یہ بات

بے شبہ ہے کہ گورنمنٹ سے انسان کے برتاؤ میں کچھ مدد نہیں ملتی۔ مگر عمدہ گورنمنٹ سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی آزادی سے اپنے قوائے تکمیل اور اپنی شخصی حالت کی ترقّی کرسکتا ہے۔ یہ بات روز بروز روشن ہوتی جاتی ہے کہ گورنمنٹ کا فرض بہ نسبت ثبت اور عمل ہونے کے زیادہ منفی اور مانع ہے اور وہ فرض جان اور مال اور آزادی کی حفاظت ہے جبکہ قانون کا عملدرآمد دانشمندی سے ہوتا ہے تو آدمی اپنی جسمی اور ذہنی محنت کے ثمروں کا بے خطرہ خط اُٹھاسکتا ہے۔ جس قدر گورنمنٹ کی حکومت ہوتی ہے اُتنا ہی ذاتی نقصان کم ہوتا ہے مگر کوئی قانون گو وہ کیسا ہی اُبھارنے والا کیوں نہ ہو سُست آدمی کو محنتی۔ فضول خرچ کو کفایت شعار۔ شراب خوار کو تائب نہیں بنا سکتا بلکہ یہ باتیں شخصی محنت۔ کفایت شعاری نفس کشی سے حاصل ہوسکتی ہیں قومی ترقی۔ قومی عزّت۔ قومی اصلاح۔ عمدہ عادتوں۔ عمدہ چال چلن۔ عمدہ برتاؤ کرنیسے ہوتی ہے۔ نہ گورنمنٹ میں بڑے بڑے حقوق اور اعلیٰ اعلیٰ درجہ حاصل کرنیسے۔

پُرانے لوگوں کا مقولہ ہے کہ "النَّاسُ عَلٰی دِینِ مُلُوکِھِم" اگر اس مقولہ میں "الناس" سے چند خاص آدمی مُراد لئے جاویں جو بادشاہ کے مقرّب ہوتے ہیں تو یہ مقولہ صحیح ہے اور اگر یہ معنی لئے جاویں کہ رعایا اپنی گورنمنٹ کی سی ہو جاتی ہے تو یہ مقولہ صحیح نہیں ہے رعایا کبھی گورنمنٹ کے رنگ میں نہیں رنگی جاتی۔ بلکہ گورنمنٹ رعایا کا رنگ بدلتی جاتی ہے۔ نہایت

ٹھیک بات ہے کہ گورنمنٹ عموماً اُن لوگوں کا جن پر وہ حکومت کرتی ہے عکس ہوتی ہے جو رنگ ان کا ہوتا ہے اسی کا عکس گورنمنٹ میں پایا جاتا ہے۔ جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے تہذیب و شائستگی میں آگے بڑھی ہوئی ہے۔ رعایا اُس کو زبردستی سے پیچھے کھینچ لاتی ہے۔ اور جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے کمتر اور تہذیب و شائستگی میں پیچھے ہوتی ہے وہ ترقی کے دوڑ میں رعایا کے ساتھ آگے کھچ جاتی ہے۔ تاریخ کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان و انگلستان کا یہی حال ہوا۔ انگلستان کی رعایا تہذیب و شائستگی میں اُس زمانے کی گورنمنٹ سے آگے بڑھی ہوئی تھی۔ اُس نے زبردستی سے گورنمنٹ کو اپنے ساتھ آگے کھینچ لیا۔ ہندوستان کی رعایا تہذیب و شائستگی میں موجودہ گورنمنٹ سے کوسوں پیچھے پڑی ہے۔ گورنمنٹ کتنا کھینچنا چاہتی ہے مگر وہ نہیں کھنچتی بلکہ زبردستی سے گورنمنٹ کو پیچھے کھینچ لاتی ہے یہ ایک نیچر کا قاعدہ ہے کہ جیسا مجموعہ قوم کے چال چلن کا ہوتا ہے یقینی اُسی کے موافق اُس کے قانون اور اسی کے مناسب حال گورنمنٹ ہوتی ہے کہ جس طرح پانی اپنی پنسال میں آجاتا ہے۔ اسی طرح عمدہ رعایا پر عمدہ حکومت ہوتی ہے اور جاہل و خراب و ناتربیت یافتہ رعایا پر ویسی ہی اکثر حکومت کرنی پڑتی ہے۔ تمام تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ کسی مُلک کی خوبی و عمدگی

اور قدر و منزلت بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عمدہ ہونے کے زیادہ تر
اُس مُلک کی رعایا کے چال چلن۔ اخلاق و عادت۔ تہذیب و شائستگی
پر منحصر ہے۔ کیونکہ قوم شخصی حالت کا مجموعہ ہے اور ایک قوم کی تہذیب
درحقیقت اُن مرد و عورت و بچوں کی شخصی ترقی ہے جن سے وہ قوم بنتی ہے
قومی ترقی مجموعہ ہے شخصی محنت شخصی عزّت۔ شخصی ایمانداری۔ شخصی ہمدردی
کا۔ اسی طرح قومی تنزل مجموعہ ہے شخصی سستی۔ شخصی بے عزّتی۔ شخصی بے ایمانی
شخصی خودغرضی کا اور شخصی بُرائیوں کا۔ ناتہذیبی و بدچلنی جو اخلاقی و تمدنی یا
باہمی معاشرت کی بدیوں میں شمار ہوتی ہے درحقیقت وہ خود اُسی شخصی
کی آوارہ زندگی کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ بیرونی کوشش سے اُن بُرائیوں
کو جڑ سے اُکھاڑ ڈالیں اور نیست و نابود کر دیں تو یہ بُرائیاں کسی اور نئی
صورت میں اُس سے بھی زیادہ زور شور سے پیدا ہو جاوینگی۔ جب تک
شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کی حالتوں کی ترقی نہ کی جاوے۔ اے
میرے عزیز ہموطنو اگر یہ راے صحیح ہے تو اُس کا یہ نتیجہ ہے کہ قوم کی سچّی
ہمدردی اور سچّی خیرخواہی کرو۔ غور کرو کہ تمہاری قوم کی شخصی زندگی اور شخصی
چال چلن کس طرح پر عمدہ ہو تاکہ تم بھی ایک معزز قوم بنو۔ کیا جو طریقہ تعلیم
و تربیت کا۔ بات چیت کا وضع و لباس کا۔ سیر سپاٹے کا۔ شغل اشغال کا
تمہاری اولاد کے لئے ہے، اُس سے اُن کے شخصی چال چلن اخلاق و

عادت نیکی و سچائی میں ترقی ہو سکتی ہے؟ حاشا و کلّا۔ جبکہ ہر شخص و کل قوم خود اپنی اندرونی حالتوں سے آپ اپنی اصلاح کر سکتی ہے تو اس بات کی امید پر بیٹھے رہنا کہ بیرونی زور انسان کی یا قوم کی اصلاح و ترقی کرے۔ کس قدر افسوس بلکہ نادانی کی بات ہے۔ وہ شخص درحقیقت غلام نہیں ہے جس کو ایک ناخدا ترس نے جو اُس کا ظالم آقا کہلایا جاتا ہے خرید لیا ہے یا ایک ظالم اور خود مختار بادشاہ یا گورنمنٹ کی رعیّت ہے بلکہ درحقیقت وہ شخص اصلی غلام ہے جو بد اخلاقی۔ خود غرضی۔ جہالت اور شرارت کا مطیع اور اپنی خود غرضی کی غلامی میں مبتلا اور قومی ہمدردی سے بے پروا ہے۔ وہ قومیں جو اس طرح دل میں غلام ہیں۔ وہ بیرونی زوروں سے یعنی عمدہ گورنمنٹ یا عمدہ قومی انتظام سے آزاد نہیں ہو سکتیں جب تک کہ غلامی کی یہ دلی حالت دور نہ ہو۔ اصل یہ ہے کہ جب تک انسانوں میں خیال کہ ہماری اصلاح و ترقی گورنمنٹ پر یا قوم کے عمدہ انتظام پر منحصر ہے اسوقت تک کوئی مستقل اور برتاؤ میں آنے کے قابل نتیجہ اصلاح و ترقی کا قوم میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ گو کیسی ہی عمدہ تبدیلیاں گورنمنٹ یا انتظام میں کی جاویں۔ وہ تبدیلیاں فانوس خیال سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتیں جیسیں طرح طرح کی تصویریں پھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ مگر جب دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔ مستقل اور مضبوط آزادی سچی عزت۔ اصلی ترقی۔ شخصی چال چلن کے عمدہ ہونے پر

منحصر ہے اور وہی شخصی چال چلن معاشرت و تمدن کا محافظ اور وہی شخصی
چال چلن۔ قومی ترقی کا بڑا ضامن ہے۔ جان اسٹیورٹ مل جو اسی زمانہ
میں ایک بہت بڑا دانا حکیم گزرا ہے اُسکا قول ہے کہ "ظالم اور خود مختار
حکومت بھی زیادہ خراب نتیجے پیدا نہیں کرسکتی اگر اُس کی رعایا میں شخصی
اصلاح اور شخصی ترقی موجود ہے اور جو چیز کہ شخصی اصلاح و شخصی ترقی کو دبا
دیتی ہے درحقیقت وہی شے اُس کے لئے ظالم و خود مختار گورنمنٹ ہے
پھر اُس شے کو جس نام سے چاہو پکارو"۔ اس مقولہ پر میں اس قدر اور زیادہ
کرتا ہوں کہ جہاں شخصی اصلاح و شخصی ترقی مٹ گئی ہے یا دب گئی ہے
وہاں کیسی ہی آزاد اور عمدہ گورنمنٹ کیوں نہ قائم کی جاوے وہ کچھ بھی عمدہ
نتیجے پیدا نہیں کرسکتی اور اس اپنے مقولہ کی تصدیق کو ہندوستان کی
اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کی مثال پیش کرتا ہوں
اے مسلمان بھائیو کیا تمہاری یہی حالت نہیں ہے؟ تم نے اس عمدہ
گورنمنٹ سے جو تم پر حکومت کر رہی ہے کیا فائدہ اُٹھایا ہے؟ تمہاری
آزادی کے محفوظ رکھنے کا تم کو کیا نتیجہ حاصل ہوا ہے؟ ہیچ ہیچ ہیچ۔ اسکا
سبب یہی ہے کہ تم میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ نہیں ہے۔ انسان
کی قومی ترقی کی نسبت ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں کہ کوئی خضر ملے۔ گورنمنٹ
فیاض ہو اور ہمارے سب کام کردے۔ اِس کے یہ معنی ہیں کہ ہر چیز ہمارے

لئے کی جاوے اور ہم خود نہ کریں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اگر اس کو ہادی اور رہنما بنایا جاوے تو تمام قوم کی دلی آزادی کو برباد کردے اور آدمیوں کو انسان پرست بنادے۔ حقیقت میں ایسا ہونا قوت کی پرستش ہے اور اُس کے نتائج انسان کو ایسا ہی حقیر بنا دیتے ہیں جیسے کہ صرف دولت کی پرستش سے انسان حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے۔ کیا لالہ اشرفی مل جو روز لچھمی کی پوجا کرتے ہیں اور بے انتہا دولت رکھتے ہیں۔ انسانوں میں کچھ قدر و منزلت کے لائق گنے جاتے ہیں؟ بڑا سچّا مسئلہ اور نہایت مضبوط۔ جس سے دنیا کی معزز قوموں نے عزّت پائی ہے وہ اپنی آپ مدد کرنا ہے۔ جسوقت لوگ اُسکو اچھی طرح سمجھیں گے اور کام میں لاویں گے تو پھر خضر کو ڈھونڈنا بھول جاوینگے اوروں پر بھروسہ اور اپنی مدد آپ۔ یہ دونوں اصول ایک دوسرے کے بالکل خلاف ہیں۔ پچھلا انسان کی بدیوں کو برباد کرتا ہے اور پہلا خود انسان کو۔ قومی انتظام یا عمدہ قوانین کے اجرا کی خواہش یہ بھی ایک قدیمی غلط خیال ہے۔ سچّا اصول وہ ہے جو ولیم ڈراگن نے ڈبلن کی نمائش گاہ دستکاری میں کہا تھا جو ایک بڑا خیر خواہ آئرلینڈ کا تھا۔ اُس نے کہا کہ "جس وقت میں آزادی کا لفظ سُنتا ہوں اُسی وقت مجھ کو میرا ملک اور میرے شہر کے باشندے یاد آتے ہیں۔ ہم اپنی آزادی کے لئے بہت سی باتیں سُنتے آئے ہیں مگر میرے دل میں بہت بڑا مضبوط یقین ہے کہ ہماری محنت۔ ہماری آزادی

ہمارے اوپر منحصر ہے، میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ہم محنت کئے جاویں اور اپنی قوتوں
کو ٹھیک طور پر استعمال کریں تو اس سے زیادہ ہم کو کوئی موقع یا آیندہ کی قومی
توقع اپنی بہتری کے لئے نہیں ہے۔ استقلال اور محنت کامیابی کا بڑا ذریعہ ہے
اگر ہم دلی ولولہ اور محنت سے کام کئے جاینگے تو مجھے پورا یقین ہے کہ تھوڑے زمانہ
میں ہماری حالت بھی ایک عمدہ قوم کے مانند آرام وخوشی وآزادی کی ہوجائیگی"۔
انسان کی اگلی پشتوں کے حالات پر خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی
موجودہ حالت انسانوں کی نسل در نسل کے کاموں سے حاصل ہوئی ہے۔ محنتی اور
مستقل مزاج محنت کرنے والوں۔ زمین کے جوتنے والوں۔ کانوں کے کھودنے
والوں۔ نئی نئی باتوں کے ایجاد کرنیوالوں۔ مخفی باتوں کو ڈھونڈکر نکالنے والوں
آلات جرثقیل سے کام لینے والوں اور ہر قسم کے پیشہ کرنیوالوں۔ ہنرمندوں شاعروں
حکیموں۔ فیلسوفوں۔ ملکی منتظموں نے انسان کو موجودہ ترقی کی حالت پر پہونچانے
میں بڑی مدد دی ہے۔ ایک نسل نے دوسری نسل کی محنت پر عمارت بنائی
اور اُسکو ایک اعلیٰ درجہ تک پہونچایا ہے۔ ان عمدہ کاریگروں سے جو تہذیب وشایستگی
کی عمارت کے معمار ہیں لگاتار ایک دوسرے کے بعد ہونے سے محنت اور علم وہنر میں جو ایک
بے ترتیبی کیجا تھیں تھے ایک ترتیب پیدا ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ نیچر کی گردش نے موجودہ
نسل کو اُس زرخیز اور بے بہا جائداد کا وارث کیا ہے جو ہمارے پرکھوں کی ہوشیاری
اور محنت سے مہیا ہوئی تھی اور وہ جائداد ہمکو اسلئے نہیں دی گئی ہے کہ ہم صرف مثل مار سر گنج

اُسکی حفاظت ہی کیا کریں بلکہ ہمکو اسلئے دی گئی ہے کہ اُس کو ترقی دیں اور ترقی
یافتہ حالت میں آیندہ نسلوں کے لئے چھوڑ جاویں مگر افسوس صد ہزار افسوس کہ
ہماری قوم نے اُن بزرگوں کی چھوڑی ہوئی جائداد کو بھی گرا دیا۔ انگریزوں کو
جو دُنیا کے اس دَور میں اس قدر ترقی ہوئی اُسکا سبب صرف یہی ہے کہ ہمیشہ
اُنکی قوم میں اپنی مدد آپ کرنیکا جذبہ رہا ہے اور اُس قوم کی شخصی محنت اُسپر
گواہ عادل ہے۔ یہی مسئلہ اپنی مدد آپ کرنے کا انگریزوں کی قوم کی طاقت
کا سچّا پیمانہ رہا ہے۔ انگریزوں میں اگرچہ بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو
تمام لوگوں سے اعلیٰ درجہ کے اور زیادہ مشہور تھے اور جن کی تمام لوگ عزّت
بھی کرتے تھے۔ لیکن کم درجہ کے اور غیر مشہور آدمیوں کے گروہوں میں سے
بھی اُس قوم کو بڑی ترقی ہوئی ہے۔ گو کسی لڑائی اور میدان کارزار کی
فہرستوں اور تاریخوں میں صرف بڑے بڑے جنرلوں اور سپہ سالاروں کے نام
لکھے گئے ہوں۔ لیکن وہ فتوحات اُن کو زیادہ تر اُنھیں لوگوں کی شجاعت
اور بہادری کے سبب سے ہوئی ہیں۔ عام لوگ ہی تمام زمانوں میں
سب سے زیادہ کام کرنے والے ہوئے ہیں بہت سے ایسے شخص ہیں
جن کی زندگی کا حال کسی نے نہیں لکھا۔ لیکن تہذیب و شائستگی اور ترقی
پر اُن کا بھی ایسا ہی قوی اثر ہوا ہے جیسا کہ اُن خوش نصیب مشہور نامور
آدمیوں کا ہوا ہے جن کی زندگی کے حالات مؤرخوں نے اپنی تاریخوں میں

لکھے ہیں۔ ایک نہایت عاجز و مسکین غریب آدمی جو اپنے ساتھیوں کو محنت اور پرہیزگاری اور بے لگاؤ ایمانداری کی نظیر دکھاتا ہے اُس شخص کا اُس زمانے میں اور آیندہ زمانے میں اُس کے مُلک اُسکی قوم کی بھلائی پر بہت بڑا اثر پیدا ہوتا ہے کیونکہ اُس کی زندگی کا طریقہ اور چال و چلن گو معلوم نہیں ہوتا مگر اور شخصوں کی زندگی میں خفیہ خفیہ پھیل جاتا ہے اور آیندہ کی نسل کے لئے ایک عمدہ نظیر بن جاتا ہے۔ ہر روز کے تجربہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شخصی ہی چال چلن میں یہ قوت ہے کہ دوسرے کی زندگی اور برتاؤ اور چال چلن پر نہایت قوی اثر پیدا کرتا ہے اور حقیقت میں یہی ایک نہایت عمدہ عملی تعلیم ہے اور جب ہم اس عملی تعلیم کا علمی تعلیم سے مقابلہ کریں تو مکتب و مدرسہ اور مدرستہ العلوم کی تعلیم اس عملی تعلیم کی ابتدائی تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کے علم کا یعنی زندگی کے برتاؤ کے علم کا جس کو انگریزی میں "لیف ایجوکیشن"، کہتے ہیں انسان پر۔ قوم پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ مکتب و مدرسہ و مدرستہ العلوم کا علم طاق یا صندوق یا الماری میں یا کسی بڑے کتب خانہ میں رکھا ہوا ہوتا ہے مگر زندگی کے برتاؤ کا علم ہر وقت دوست سے ملنے میں گھر کے رہنے سہنے میں۔ شہر کی گلیوں میں پھرنے میں صرافہ کی دوکان کرنے میں، ہل جوتنے میں۔ کپڑا بننے کے کارخانہ میں کلوں سے کام کرنے کے کارخانے میں اپنے ساتھ ہی ہوتا

ہے اور پھر بے سکھائے اور بے شاگرد کیے لوگوں میں صرف اُس کے برتاؤ سے پھیلتا جاتا ہے۔ یہ پچھلا علم وہ علم ہے جو انسان کو انسان بناتا ہے۔ اسی پچھلے علم سے عمل۔ چال چلن۔ تعلیم نفسی۔ نفس کشی۔ شخصی خوبی۔ قومی مضبوطی قومی عزت حاصل ہوتی ہے۔ یہی پچھلا علم وہ علم ہے کہ جو انسان کو اپنے فرائض ادا کرنے اور دوسروں کے حقوق محفوظ رکھنے اور زندگی کے کاروبار کرنے اور اپنی عاقبت کے سنوارنے کے لائق بنا دیتا ہے۔ اس علم کو آدمی صرف کتابوں سے نہیں سیکھ سکتا اور نہ یہ تعلیم کسی درجے کی علمی تحصیل سے حاصل ہوتی ہے۔ لارڈ بیکن کا نہایت عمدہ قول ہے کہ "علم سے عمل نہیں آجاتا۔ علم کو عمل میں لانا علم سے باہر اور علم سے برتر ہے اور مشاہدہ آدمی کی زندگی کو درست اور اُس کے علم کو باعمل یعنی اُس کے برتاؤ میں داخل کر دیتا ہے۔ علم کی بہ نسبت عمل اور سوانح عمری کی بہ نسبت عمدہ چال چلن آدمی کو زیادہ تر معزز اور قابل ادب بنا دیتا ہے"۔ کیا یہی وجہ ہے جو مدرسۃ العلوم مسلمانان کے بانیوں نے یہ تجویز کی ہے کہ مسلمانوں کے لڑکے گھروں سے اور بد صحبتوں سے علیحدہ مدرسۃ العلوم میں عالموں اور اشرافوں اور تربیت یافتہ لوگوں کی صحبت میں رکھے جاویں؟

شمس العلما مولانا شبلی نعمانی

پیدائش اعظم گڈھ ۱۸۵۷ء

اعظم گڈھ آپ کا وطن ہے۔ ابتدائی تعلیم اسی ضلع میں پائی۔ پھر غازیپور میں مولوی محمد فاروق صاحب چڑیا کوٹی سے معقولات و فلسفہ پڑھا۔ ازاں بعد سہارن پور میں مولانا احمد علی محدث سے حدیث پڑھی۔ اسی اثنا میں آپ حج کو تشریف لے گئے۔ حج سے واپس آکر لاہور میں ادب کی تحصیل کی۔ تحصیل علم سے فارغ ہو کر کچھ دن سرکاری نوکری اور پھر وکالت کی۔ لیکن یہ پیشہ طبیعت کے خلاف تھا اس لئے چھوڑ دیا۔ ۱۸۸۳ء میں مولانا شبلی علی گڈھ میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ اسی زمانہ میں آپ نے ٹرکی مصر و شام کا سفر کیا۔ اس سفر سے واپس آنے پر گورنمنٹ سے آپ کو شمس العلما کا خطاب عطا ہوا۔ سولہ برس کی ملازمت کے بعد علی گڈھ کالج چھوڑ کر مولانا خانہ نشین ہو گئے لیکن چند ہی روز بعد حیدر آباد میں ناظم علوم و فنون کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ چار برس تک حیدر آباد میں رہے، مگر یہ معلوم کر کے کہ ندوۃ العلما کی حالت خراب ہے، استعفا دیکر چلے آئے۔ آج کل آپ لکھنؤ میں ندوۃ العلما کے آنریری سکریٹری ہیں اور اس خدمت کو احسن طریقہ سے انجام دے رہے ہیں۔ حیدرآباد

میں جو منصب مقرر ہوا تھا وہ اب تک قائم ہے۔

مولانا شبلی سے اُردو نثر میں اکثر تصانیف یادگار ہیں۔ الفاروق المامون۔ الجزیہ۔ رسائل شبلی۔ خاص کر اسلامی مضامین سے متعلق ہیں اور اُن سے آپ کے تاریخی ذوق و تحقیقات کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے علاوہ سفرنامہ روم و مصر و شام۔ سوانح عمری مولانا روم۔ موازنہ انیس و دبیر شعرالعجم۔ ایسی کتابیں ہیں جن سے ہر مذہب و ملت کے لوگ یکساں فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ مولانا شبلی اُن معدودے چند مصنفوں میں ہیں جنھوں نے کریٹی سزم کے اصلی مفہوم کو سمجھا ہے اور کوشش کی ہے کہ تنقید کا حق اُردو میں بھی ادا کیا جائے۔ آپ کا طرزِ تحریر سلیس پُرزور اور دلپذیر ہے۔ شعر اُردو اور فارسی دونوں میں کہتے ہیں اردو نظم میں مثنوی صبح اُمید آپ سے یادگار ہے۔

شاعری

ماخوذ از شعرالعجم جلد چہارم

شاعری کی حقیقت شاعری چونکہ وجدانی اور ذوقی چیز ہے اس لئے اس کی جامع اور مانع تعریف چند الفاظ میں نہیں کی جا سکتی اس بنا پر مختلف طریقوں سے

اسکی حقیقت کا سمجھنا زیادہ مفید ہو گا کہ ان سب کے مجموعہ سے شاعری کا ایک صحیح نقشہ پیش نظر ہو جائے۔

خدا نے انسان کو مختلف اعضا اور مختلف قوتیں دی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے فرائض اور تعلقات الگ ہیں۔ ان میں سے دو قوتیں تمام افعال اور ارادات کا سرچشمہ ہیں ادراک اور احساس ادراک کا کام اشیا کا معلوم کرنا اور استدلال اور استنباط سے کام لینا ہے۔ ہر قسم کے ایجادات۔ تحقیقات۔ انکشافات اور تمام علوم و فنون اسی کے نتائج عمل ہیں۔

احساس کا کام کسی چیز کا ادراک کرنا یا کسی مسئلہ کا حل کرنا یا کسی بات پر غور کرنا اور سوچنا نہیں ہے اس کا کام صرف یہ ہے کہ جب کوئی موثر واقعہ پیش آتا ہے تو وہ متاثر ہو جاتا ہے غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے۔ خوشی میں سرور ہوتا ہے حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے یہی قوت جس کو احساس انفعال۔ یا فیلنگ سے تعبیر کر سکتے ہیں شاعری کا دوسرا نام ہے۔ یعنی یہی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے۔

حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو مختلف قسم کی آوازوں یا حرکتوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً شیر گونجتا ہے مور چنگھاڑتے ہیں کوئل کوکتی ہے طاؤس ناچتا ہے سانپ لہراتے ہیں انسان کے جذبات بھی حرکات کے ذریعہ سے ادا ہوتے ہیں لیکن اس کو جانوروں سے

بڑھ کر ایک اور قوت دی گئی ہے یعنی نطق اور گویائی اس لئے جب اس پر
کوئی قوی جذبہ طاری ہوتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے موزوں
الفاظ نکلتے ہیں، اسی کا نام شعر ہے۔

اب منطقی پیرایہ میں شعر کی تعریف کرنا چاہیں تو یوں کہ سکتے ہیں کہ
جو جذبات الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہوں وہ شعر ہیں اور چونکہ یہ الفاظ سامعین
کے جذبات پر بھی اثر کرتے ہیں یعنی سننے والوں پر بھی وہی اثر طاری
ہوتا ہے جو صاحب جذبہ کے دل پر طاری ہوتا ہے اس لئے شعر کی
تعریف یوں بھی کر سکتے ہیں کہ جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے
اور ان کو تحریک میں لاوے وہ شعر ہے۔

ایک یورپین مصنف لکھتا ہے کہ "ہر چیز جو دل پر استعجاب یا حیرت
یا جوش یا اور کسی قسم کا اثر پیدا کرتی ہے شعر ہے"، اس بنا پر فلک نیلگوں
نجم درخشاں۔ نسیم سحر گلگونۂ شفق۔ تبسم گل۔ خرام صبا۔ نالۂ بلبل۔ ویرانی دشت
شادابی چمن۔ غرض تمام عالم شعر ہے۔ یہ آج کل کا خیال ہے لیکن عجیب
بات ہے کہ حضرت خواجہ فریدالدین عطار نے آج سے چھ سو برس پہلے
کہا تھا۔ ع

پس جہاں شاعر بود چوں دیگراں

جو چیزیں دل پر اثر کرتی ہیں بہت سی ہیں مثلاً موسیقی مصوری

صنعت گری وغیرہ لیکن شاعری کی اثر انگیزی کی حد سب سے زیادہ وسیع ہے۔ موسیقی صرف قوت سامعہ کو محظوظ کر سکتی ہے۔ سامعہ نہ ہو تو وہ کچھ کام نہیں کر سکتی۔ تصویر سے متاثر ہونے کے لئے بینائی شرط ہے۔ لیکن شاعری تمام حواس پر اثر ڈال سکتی ہے۔ باصرہ۔ ذائقہ۔ شامہ۔ لامسہ سب اس سے لطف اُٹھا سکتے ہیں۔ فرض کرو شراب آنکھوں کے سامنے نہیں ہے اس لئے آنکھ اس وقت اس سے حظ نہیں اُٹھا سکتی لیکن جب ایک شاعر اس کو آتش سیال سے تعبیر کرتا ہے تو اُن الفاظ سے ایک موثر منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

کسی[۱] چیز کی حقیقت اور ماہیت کے تعین کرنے کا آسان علمی طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کا کوئی نمایاں وصف لیا جائے پھر یہ دیکھا جائے کہ اس وصف میں اور کیا کیا چیزیں اس کے ساتھ شریک ہیں۔ پھر ان صفات کو ایک ایک کر کے متعین کیا جائے جن کی وجہ سے یہ چیز اپنی اور ہم جنس چیزوں سے الگ اور ممتاز ہو گئی ہے۔

اس قدر سب تسلیم کرتے ہیں کہ شعر کا نمایاں وصف جذبات انسانی کا برانگیختہ کرنا ہے یعنی اس کو سُنکر دل میں رنج یا خوشی یا جوش کا اثر پیدا ہوتا ہے یہ خصوصیت شاعری کو سائنس اور علوم وفنون سے ممتاز کر دیتی

---

[۱] یہ تمام تقریر مل صاحب کے مضمون سے ماخوذ ہے۔

ہے۔شاعری کا تخاطب جذبات سے ہے اور سائنس کا یقین ہے۔سائنس
استدلال سے کام لیتا ہے اور شاعری محرکات کو استعمال کرتی ہے۔سائنس
عقل کے سامنے کوئی علمی مسئلہ پیش کرتا ہے۔ لیکن شاعری احساسات
کو دلکش منظر دکھاتی ہے۔ لیکن یہ خاصیت موسیقی تصویر بلکہ مناظر قدرت
میں بھی پائی جاتی ہے۔اس لئے کلام یا الفاظ کی قید لگائی جاتی ہے کہ یہ چیزیں
بھی اس دائرہ سے نکل جائیں تاہم خطبہ (لکچر) تاریخ افسانہ اور ڈراما شاعری
کی حد میں داخل رہیں گی ان میں اور شعر میں حد فاصل قائم کرنا مشکل ہے
زیادہ دقت اس لئے ہوتی ہے کہ اکثر اعلیٰ نظمیں افسانہ کی شکل میں ہوتی
ہیں اور اکثر افسانوں میں شاعری کی روح پائی جاتی ہے اس لئے دونوں
جب باہم مل جاتے ہیں تو ان میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن حقیقت
یہ ہے کہ افسانہ اُسی حد تک افسانہ ہے جہاں تک اُس میں خارجی واقعات
اور زندگی کی تصویر ہوتی ہے۔جہاں سے اندرونی جذبات اور احساسات
شروع ہوتے ہیں وہاں شاعری کی سرحد آجاتی ہے۔ افسانہ نگار بیرونی
اشیا کا استقصا کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے۔ بخلاف اس کے شاعر اندرونی
جذبات اور احساسات کی نیرنگیوں کا ماہر بلکہ تجربہ کار ہوتا ہے۔

تاریخ اور شعر کا فرق ایک مثال کے ذریعہ سے اچھی طرح سمجھ میں آسکتا
ہے۔ایک شخص جنگل میں جا رہا ہے کسی گوشہ سے ایک مہیب شیر ڈکارتا ہوا

نکلا اس کی پر رعب گونج بھیانک چہرہ خشمگیں آنکھوں نے اس شخص کے دل کو لرزا دیا۔ یہ شخص کسی کے سامنے شیر کا حلیہ اور شکل و صورت جن موثر لفظوں میں بیان کرے گا وہ شعر ہے۔

علم الحیوانات کا ایک عالم کسی عجائب خانہ میں جاتا ہے وہاں ایک شیر کٹہرہ میں بند ہے۔ یہ عالم شیر کے ایک ایک عضو کو علمی حیثیت سے دیکھتا ہے اور علمی طریقہ سے کسی مجمع کے سامنے شیر پر لکچر دیتا ہے۔ یہ سائنس یا تاریخ یا واقعہ نگاری ہے۔

شاعری کے اقسام میں ایک قسم واقعہ نگاری ہے یعنی شاعر خارجی واقعات کی تصویر کھینچتا ہے لیکن اس حیثیت سے نہیں کہ فی نفسہ وہ کیا ہیں بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ ہمارے جذبات پر کیا اثر ڈالتی ہیں۔ شاعر ان اشیا کے سادہ خط و خال کی تصویر نہیں کھینچتا بلکہ ان میں قوت تخئیل کا رنگ بھرتا ہے تاکہ موثر بن جاے۔

اس تقریر سے شاعری اور واقعہ نگاری کا فرق واضح ہو جاتا ہے لیکن خطابت اور شاعری کی حد فاصل اب بھی نہیں قائم ہوئی خطابت میں بھی شاعری کی طرح جذبات اور احساسات کا برانگیختہ کرنا مقصود ہوتا ہے لیکن حقیقت میں شاعری اور خطابت بالکل جدا جدا چیزیں ہیں خطابت کا مقصود حاضرین سے خطاب کرنا ہوتا ہے اسپیکر[۱] حاضرین

۱؎ خطیب

کے مذاق معتقدات اور میلان طبع کی جستجو کرتا ہے تاکہ اس کے لحاظ سے تقریر
کا ایسا پیرایہ اختیار کرے جس سے ان کے جذبات کو برانگیختہ کر سکے اور
اپنے کام میں لائے بخلاف اس کے شاعر کو دوسروں سے غرض
نہیں ہوتی وہ یہ نہیں جانتا کہ کوئی اس کے سامنے ہے بھی یا
نہیں ؟ اس کے دل میں جذبات پیدا ہوتے ہیں وہ بے اختیار ان
جذبات کو ظاہر کرتا ہے ۔ جس طرح درد کی حالت میں بے ساختہ آہ
نکل جاتی ہے، بے شبہ یہ اشعار اوروں کے سامنے پڑھے جائیں تو
ان کے دل پر اثر کریں گے لیکن شاعر نے اس غرض کو پیش نظر
نہیں رکھا تھا۔ جس طرح کوئی شخص اپنے عزیز کے مرنے پر نوحہ کرتا
ہے تو اس کی یہ غرض نہیں ہوتی کہ لوگوں کو سنائے لیکن اگر کوئی
شخص سن لے تو ضرور تڑپ جائیگا۔

اصلی شاعر وہی ہے جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو لیکن جو
لوگ بہ تکلف شاعر بنتے ہیں اُن کا بھی فرض ہے کہ ان کے انداز کلام
سے مطلق نہ پایا جاے کہ وہ سامعین کو مخاطب کرنا چاہتے ہیں ایک
ایکٹر کو خوب معلوم ہے کہ بہت سے حاضرین اس کے سامنے موجود
ہیں لیکن اگر ایکٹ کرنے کی حالت میں وہ اس علم کا اظہار کر دے
تو سارا پارٹ غارت ہو جائیگا۔ شاعر اگر اپنے نفس کے بجاے دوسرں

سے خطاب کرتا ہے دوسروں کے جذبات کو اُبھارنا چاہتا ہے جو کچھ کہتا ہے جو کچھ کہتا ہے اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے کہتا ہے تو شاعر نہیں بلکہ خطیب ہے۔ اس سے یہ واضح ہوگا کہ شاعری تنہا نشینی اور مطالعہ نفس کا نتیجہ ہے بخلاف اس کے خطابت لوگوں سے ملنے جلنے اور راہ و رسم رکھنے کا ثمرہ ہے۔ اگر ایک شخص کے اندرونی احساسات تیز اور مشتعل ہیں تو وہ شاعر ہو سکتا ہے لیکن خطیب کے لئے ضرور ہے کہ دوسروں کے جذبات اور احساسات کا نباض ہو۔

شاعری کے اصلی عناصر کیا ہیں؟

ایک عمدہ شعر میں بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں اسمیں وزن ہوتا ہے محاکات ہوتی ہے یعنی کسی چیز یا کسی حالت کی تصویر کھینچی جاتی ہے خیال بندی ہوتی ہے۔ الفاظ سادہ اور شیریں ہوتے ہیں بندش صاف ہوتی ہے طرز ادا میں جدت ہوتی ہے لیکن کیا یہ سب چیزیں شاعری کے اجزا ہیں؟ کیا ان میں سے ہر ایک ایسی چیز ہے؟ اگر وہ نہ ہوتی تو شعر شعر نہ ہوتا اگر ایسا نہیں ہے اور قطعاً نہیں ہے تو ان تمام اوصاف میں خاص اُن چیزوں کو متعین کر دینا چاہیئے جن کے بغیر شعر شعر نہیں رہتا۔ عام لوگوں کے نزدیک یہ چیز وزن ہے اسی لئے عام لوگ کلام موزوں کو شعر کہتے ہیں لیکن محققین کی یہ رائے نہیں وہ وزن کو شعر کا ایک ضروری جزو سمجھتے ہیں تاہم ان کے نزدیک وہ شاعری کا اصل عنصر نہیں ہے۔

ارسطو کے نزدیک یہ چیز محاکات یعنی مصوّری ہے لیکن یہ بھی
بھی صحیح نہیں اگر کسی شعر میں تخئیل ہو اور محاکات نہ ہو تو کیا وہ شعر نہ ہوگا؟
سیکڑوں اشعار ہیں جن میں محاکات کے بجائے صرف تخئیل ہے اور باوجود
اس کے وہ عمدہ شعر خیال کئے جاتے ہیں شاید یہ کہا جائے کہ محاکات
ایسا وسیع مفہوم ہے کہ تخئیل اس کے دائرہ سے باہر نہیں جا سکتی۔
اسلئے تخئیل بھی محاکات ہے لیکن یہ زبردستی ہے آگے چل کر جب ہم
محاکات اور تخئیل کی تعریف لکھیں گے تو واضح ہو جائیگا کہ دونوں
الگ الگ چیزیں ہیں گو یہ ممکن ہے کہ بعض مثالوں میں دونوں کی
سرحدیں مل جائیں حقیقت یہ ہے کہ شاعری در اصل دو چیزوں کا نام
ہے۔ محاکات اور تخئیل انہیں سے ایک بات بھی پائی جاوے تو شعر شعر
کہلانے کا مستحق ہوگا باقی اور اوصاف یعنی سلاست۔ صفائی حُسن بندش
وغیرہ وغیرہ شعر کے اجزائے اصلی نہیں بلکہ عوارض اور مستحسنات ہیں۔

محاکات کی تعریف

محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اسطرح ادا کرنا ہے
کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ تصویر اور محاکات میں یہ فرق ہے
کہ تصویر میں اگرچہ مادّی اشیا کے علاوہ حالات یا جذبات کی بھی تصویر کھینچی جا سکتی
ہے۔ چنانچہ اعلیٰ درجہ کے مصوّر انسان کی ایسی تصویر کھینچ سکتے ہیں کہ چہرہ سے
جذبات انسانی مثلاً رنج۔ خوشی۔ تفکّر۔ حیرت۔ استعجاب۔ پریشانی اور بیتابی ظاہر ہو

جہانگیر کے سامنے ایک مصوّر نے ایک عورت کی تصویر پیش کی تھی جس کے تلوے سہلائے جا رہے ہیں۔ تلووں کے سہلاتے وقت چہرہ پر گدگدی کا جو اثر طاری ہوتا ہے وہ تصویر کے چہرہ سے نمایاں تھا۔ تاہم تصویر ہر جگہ محاکات کا ساتھ نہیں دے سکتی سیکڑوں گوناگوں واقعات، حالات اور واردات ہیں جو تصویر کی دسترس سے باہر ہیں مثلاً قاآنی ایک موقع پر بہار کا سماں دکھاتا ہے۔

زنک زنک نسیم زیر گلاں می خرد   غبغب ایں می مکد عارض آں می مزد

سنبل ایں می کشد گردن آں می گزد   گہ بہ چمن می چمد گہ بہ سمن می وزد

گاہ بہ شاخ درخت گہ بہ لب جوئبار

یعنی ہلکی ہلکی ہوا آئی پھولوں میں گھسی کسی پھول کا گال چوم لیا کسی کی ٹھوڑی چوس لی کسی کے بال کھینچے کسی کی گردن دانت سے کاٹی۔ کیاریوں میں کھیلتے کھیلتے چنبیلی کے پاس پہونچی اور درخت کی ٹہنیوں میں ہوتی ہوئی نہر کے کنارے پہونچ گئی۔ اس سماں کو مصوّر تصویر میں کیونکر دکھا سکتا ہے؟

یہ تو مادی اشیا تھیں خیالات۔ جذبات اور کیفیات کا ادا کرنا اور زیادہ مشکل ہے۔ تصویر اس سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکتی ہے مثلاً اس شعر میں۔

نسب نامۂ دولتِ کیقباد   ورق بر ورق ہر سوی بردباد

یہ خیال ادا کیا گیا ہے کہ دارا کے مرنے سے کیانی خاندان بالکل برباد ہو گیا۔ یہ خیال تصویر کے ذریعہ سے کیونکر ادا ہو سکتا ہے × × ×

ایک بڑا فرق عام مصوّری اور شاعرانہ مصوّری میں یہ ہے کہ تصویر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے اُسکا ایک ایک خال و خط دکھایا جائے ورنہ تصویر ناتمام اور غیر مطابق ہوگی بخلاف اس کے شاعرانہ مصوّری میں یہ التزام ضروری نہیں شاعر اکثر صرف اُن چیزوں کو لیتا ہے اور اُنکو نمایاں کرتا ہے جن سے ہمارے جذبات پر اثر پڑتا ہے، باقی چیزوں کو وہ نظر انداز کرتا ہے یا اُن کو دھندلا رکھتا ہے کہ اثر اندازی میں اُن سے خلل نہ آئے فرض کرو کہ ایک پھول کی تصویر کھینچنی ہو تو مصوّر کا کمال یہ ہے کہ ایک ایک پنکھڑی اور ایک ایک رگ و ریشہ دکھائے لیکن شاعر کے لئے ضروری نہیں ممکن ہے کہ وہ ان چیزوں کو اجمالی اور غیر نمایاں صورت میں دکھائے تاہم مجموعہ سے وہ اثر پیدا کردے جو اصلی پھول کے دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔

ایک اور بڑا فرق مصوّری اور محاکات میں یہ ہے کہ مصوّری کسی چیز کی تصویر کھینچنے سے زیادہ سے زیادہ وہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو خود اس چیز کو دیکھنے سے پیدا ہوتا لیکن شاعر باوجود اسکے کہ تصویر کا ہر جزو نمایاں کرکے نہیں دکھا تاہم اس سے زیادہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو اصل چیز کے دیکھنے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ سبزہ پر شبنم دیکھ کر وہ اثر نہیں پیدا ہو سکتا جو اس شعر سے ہو سکتا ہے

تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا　　کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا

تصویر کا اصلی کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو اور اگر مصور اس امر میں کامیاب ہو گیا تو اسکو کامل فن کا خطاب مل سکتا ہے۔ لیکن شاعر کو اکثر موقعوں پر دو مشکل مرحلوں کا سامنا ہوتا ہے یعنی نہ اصل کی پوری پوری تصویر کھینچ سکتا ہے کیونکہ بعض جگہ اس قسم کی پوری مطابقت احساسات کو برانگیختہ نہیں کر سکتی نہ اصل سے زیادہ دور ہو سکتا ہے ورنہ اسپر اعتراض ہوگا کہ صحیح تصویر نہیں کھینچی اس موقع پر اس کو تخیئل سے کام لینا پڑتا ہے وہ ایسی تصویر کھینچتا ہے جو اصل سے آب و تاب اور حسن و جمال میں بڑھ جاتی ہے لیکن وہ قوت تخیئل سے سامعین پر یہ اثر ڈالتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے۔ لوگوں نے اس کو امعان نظر سے نہیں دیکھا تھا اس لئے اس کا حُسن پورا نمایاں نہیں ہوا تھا۔

تخیئل | تخیئل کی تعریف ہنری لوئس نے یہ کی ہے "وہ قوت جس کا یہ کام ہے کہ ان اشیا کو جو مرئی نہیں ہیں یا جو ہمارے حواس کی کمی کی وجہ سے ہم کو نظر نہیں آتیں ہماری نظر کے سامنے کر دے" لیکن یہ تعریف پوری جامع اور مانع نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی چیزوں کی منطقی جامع اور مانع تعریف ہو بھی نہیں سکتی۔

تخیئل دراصل قوت اختراع کا نام ہے۔ عام لوگوں کے نزدیک منطق یا فلسفہ کا موجد صاحب تخیئل نہیں کہا جا سکتا بلکہ اگر خود کسی فلسفہ داں کو

اس لقب سے خطاب کیا جائے تو اسکو عار آئے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ اور شاعری میں قوت تخیل کی یکساں ضرورت ہے۔ یہی قوت تخیل ہے جو ایک طرف فلسفہ میں ایجاد اور اکتشاف مسائل کا کام دیتی ہے اور دوسری طرف شاعری میں شاعرانہ مضامین پیدا کرتی ہے چونکہ اکثر سائنس داں شاعری کا مذاق نہیں رکھتے اور شعرا فلسفہ اور سائنس سے نامانوس ہوتے ہیں اس لئے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ قوت تخیل کو فلسفہ اور سائنس سے تعلق نہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ بے شبہ عام سائنس یا فلسفہ جاننے والے جن میں قوت ایجاد نہیں۔ قوت تخیل نہیں رکھتے لیکن جو لوگ کسی مسئلہ یا فن کے موجد ہیں۔ انکی قوت تخیل سے کون انکار کرسکتا ہے۔ نیوٹن اور ارسطو میں اسی قدر زبردست قوت تخیل تھی جسقدر ہومر اور فردوسی میں البتہ دونوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں اور دونوں کی قوت تخیل کے استعمال کا طریقہ الگ الگ ہے۔ فلسفہ اور سائنس میں قوت تخیل کا استعمال اس غرض سے ہوتا ہے کہ ایک علمی مسئلہ حل کر دیا جائے۔ لیکن شاعری میں تخیل سے یہ کلام لیا جاتا ہے کہ جذبات انسانی کو تحریک ہو۔ فلسفی کو صرف ان موجودات سے غرض ہے جو واقع میں موجود ہیں۔ بخلاف اسکے شاعران موجودات سے بھی کام لیتا ہے جو مطلق موجود نہیں۔ فلسفہ کے دربار میں ہما۔ سیمرغ۔ گاوزمین۔ تخت سلیمان کی مطلق قدر نہیں۔

لیکن یہی چیزیں ایوان شاعری کی نقش و نگار ہیں فلسفی کی زبان سے اگر سیمرغ زریں پر کا لفظ نکل جائے تو ہر طرف سے ثبوت کا مطالبہ ہوگا۔ لیکن شاعر اس قسم کے فرضی مخلوقات سے اپنا عالم خیال آباد کرتا ہے اور کوئی اس سے ثبوت کا طالب نہیں ہوتا کیونکہ فلاسفر کی طرح وہ کسی مسئلہ کی تعلیم کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ وہ ہم کو صرف خوش کرنا چاہتا ہے اور بے شبہ وہ اسمیں کامیاب ہوتا ہے ایک پھول کو دیکھ کر سائنس داں تحقیقات کرنا چاہتا ہے کہ وہ نباتات کے کس خاندان سے ہے۔ اسکے رنگ میں کن رنگوں کی آمیزش ہے۔ اسکی غذا زمین کے کن اجزا سے ہے۔ اسمیں نر و مادہ دونوں کے اجزا ہیں یا صرف ایک کے؟ لیکن شاعر کو ان چیزوں سے غرض نہیں۔ پھول دیکھکر اس کو بے اختیار یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ ع

ای گل بہ تو خرسندم تو بوے کسے داری

چاند کی نسبت ایک ہیئت داں کو ان مسائل سے غرض ہے کہ وہ کن عناصر سے بنا ہے؟ آباد ہے یا ویران؟ روشن ہے یا تاریک؟ سمندر کے مدوجزر سے اسکو کیا تعلق ہے؟ وغیرہ وغیرہ لیکن شاعر کو چاند سے صرف یہ غرض ہے کہ وہ معشوق کا روے روشن ہے شاعر کے سامنے (قوت تخئیل کی بدولت) تمام بے حس اشیاء جاندار چیزیں بنجاتی ہیں اسکے کانوں میں ہر طرف سے خوش آیند صدائیں آتی ہیں زمین۔ آسمان۔ ستارے بلکہ ذرہ ذرہ

اس سے باتیں کرتا ہے + + +

محاکات کی تکمیل کن کن چیزوں سے ہوتی ہے

(۱) محاکات جب موزوں کلام کے ذریعہ سے کیجائے تو سب سے پہلے وزن کا تناسب شرط ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ درد وغم۔ رنج وجوش۔ غیظ وغضب ہر ایک کے اظہار کا لہجہ اور آواز مختلف ہے اسلیئے جس جذبہ کی محاکات مقصود ہو تو شعر کا وزن بھی اسی کے مناسب ہونا چاہئے تاکہ اس جذبہ کی پوری حالت ادا ہوسکے مثلاً فارسی میں بحر تقارب جسمیں شاہنامہ ہے رزمیہ خیالات کے لیئے موزوں ہے۔ چنانچہ فارسی میں جسقدر رزمیہ مثنویاں لکھی گئیں سب اسی بحر میں لکھی گئیں۔ اسی طرح غزل و عاشقی کے خیالات کے لئے خاص خاص بحریں ہیں۔ ان خیالات کو قصیدہ کی بحروں میں ادا کیا جائے تو تاثیر گھٹ جاتی ہے۔

(۲) محاکات کا اصلی کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو یعنی جس چیز کا بیان کیا جائے اس طرح کیا جاے کہ خود وہ شے مجسم ہو کر سامنے آجائے۔ شاعری کا اصلی مقصد طبیعت کا انبساط ہے۔ کسی چیز کی اصلی تصویر کھینچنا خود طبیعت میں انبساط پیدا کرتا ہے (وہ شے اچھی یا بُری ہے اس سے غرض نہیں) مثلاً چھپکلی ایک بدصورت جانور ہے جسکو دیکھ کر نفرت ہوتی ہے لیکن اگر ایک اُستاد مصوّر چھپکلی کی ایسی تصویر کھینچ دے کہ بال برابر فرق نہ ہو تو اسکے دیکھنے سے خواہ مخواہ لُطف آئیگا۔ اِسکی یہی

وجہ ہے کہ نقل کا اصل سے مطابق ہونا خود ایک موثر چیز ہے اب اگر وہ چیزیں جنکی محاکات مقصود ہے خود بھی دلاویز اور لطف انگیز ہوں تو محاکات کا اثر بہت بڑھجائیگا۔

(۳) اکثر چیزیں اس قسم کی ہیں کہ ان کے مختلف انواع ہوتے ہیں اور ہر نوع میں الگ خصوصیت ہوتی ہے مثلاً آواز ایک عام چیز ہے اِسکی مختلف نوعیں ہیں پست بلند شیریں کرخت سُریلی وغیرہ وغیرہ ذوقی چیزوں میں یہ فرق اور نازک ہوجاتا ہے مثلاً معشوق کی ادا ایک عام چیز ہے لیکن الگ الگ خصوصیتوں کی بنا پر انکے جُدا جُدا نام ہیں یعنی ناز وعشوہ غمزہ شوخی دنیا کی جو زبانیں وسیع اور لطیف ہیں ان میں ان دقیق فرقوں کی بنا پر ہر چیز کے لئے الگ الگ الفاظ پیدا ہوجاتے ہیں۔

اب جب کسی چیز کی محاکات مقصود ہو تو ٹھیک وہی الفاظ استعمال کرنے چاہئیں جو ان خصوصیات پر داخل کرتے ہیں۔ ساودی نے ایک نظم لکھی تھی جسکا شان نزول یہ ہے کہ اس سے اُس کے کمسن بچے نے پوچھا کہ "سیلاب کیونکر آتا ہے،" ساودی نے اسکے جواب میں یہ نظم لکھی اور دکھایا کہ سیلاب کسطرح آہستہ آہستہ شروع ہوتا ہے اور کسطرح بڑھتا جاتا ہے اس نظم میں تمام الفاظ اس قسم کے آئے ہیں کہ پانی کے بہنے گرنے پھیلنے بڑھنے (وغیرہ وغیرہ) کے وقت جو آوازیں پیدا ہوتی ہیں الفاظ

کے لہجہ سے انکا اظہار ہوتا ہے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص خوش ادائی سے
اس نظم کو پڑھے تو سننے والیکو معلوم ہوگا کہ زور شور سے سیلاب بڑھتا چلا آتا ہے۔

تخییل کی تفصیلی بحث

اگرچہ محاکات اور تخییل دونوں شعر کے عنصر ہیں لیکن حقیقت
یہ ہے کہ شاعری دراصل تخییل کا نام ہے محاکات میں جو جان آتی ہے تخییل ہی
سے آتی ہے ورنہ خالی محاکات نقالی سے زیادہ نہیں۔ قوت محاکات کا یہ کام
ہے کہ جو کچھ دیکھے یا سنے اُسکو الفاظ کے ذریعہ سے بعینہ ادا کردے لیکن ان
چیزوں میں ایک خاص ترتیب پیدا کرنا تناسب اور توافق کو کام میں لانا ان پر آب و
رنگ چڑھانا قوت تخییل کا کام ہے۔ قوت تخییل مختلف صورتوں میں عمل کرتی ہے
شاعر کی نظر میں عالم کائنات قوت تخییل سے ایک اور عالم بنجاتا ہے۔ ہم
کائنات کی دو قسمیں کرتے ہیں حساس اور غیر حساس لیکن شاعر کی عالم
تخییل کا ذرہ ذرہ جاندار اور ہوش و عقل و جذبات سے لبریز ہے۔ آفتاب
ماہتاب ستارے صبح و شام شفق باغ پھول پتے سب اس سے ہم زبانی کرتے
ہیں سب اس کے راز دار ہیں اور سب سے اسکے تعلقات ہیں + + اس
عالم میں شاعر کی تاریخ زندگی عجب دلچسپیوں سے بھری ہوتی ہے۔ بلبل
نے اسی عالم میں اس سے زمزمہ سنجی کی تعلیم پائی ہے۔ پروانے اس کے
ساتھ کھیلے ہوئے ہیں۔ شمع سے رات رات بھر وہ سوز دل کہتا رہا ہے۔
نسیم سحری کو اکثر اس نے قاصد بناکر محبوب کے یہاں بھیجا ہے۔ بارہا اس نے

غنچہ کی عین اس وقت پردہ دری کی جب وہ معشوق کا تبسم چرا رہا تھا۔

شاعر کا احساس نہایت لطیف تیز اور مشتعل ہوتا ہے عام لوگوں کے جذبات بھی خاص حالتوں میں مشتعل ہو جاتے ہیں اور اسوقت وہ بھی مظاہر قدرت سے اسی طرح خطاب کرنے لگتے ہیں خیال کرو ایک عورت جس کا جوان بیٹا مرگیا ہے کس کس طرح موت کو آسمان کو زمین کو کوسنے دیتی ہے کسطرح ان سے خطاب کرتی ہے اسکو صاف نظر آتا ہے کہ یہ سب اس کے دشمن ہیں انہی نے اسکے پیارے بیٹے کو چھین لیا ہے اُنھوں نے دانستہ اس پر ظلم کیا ہے + + +

علت و معلول اور اسباب و نتائج کا عام طرح پر جو سلسلہ تسلیم کیا جاتا ہے شاعر کی قوت تخیل کا سلسلہ اس سے بالکل الگ ہے وہ تمام اشیا کو اپنے نقطۂ خیال سے دیکھتا ہے اور یہ تمام چیزیں اسکو ایک اور سلسلہ میں مربوط نظر آتی ہیں۔ ہر چیز کی غرض غائت اسباب محرکات نتائج اسکے نزدیک وہ نہیں جو عام لوگ سمجھتے ہیں مثلاً + + +

وضع زمانہ قابلِ دیدن دوبارہ نیست زمانہ کی وضع دوبارہ دیکھنے کے قابل نہیں
رو پس نہ کرد ہر کہ ازیں خاکداں گذشت اس لئے جو یہاں سے جاتا ہے پھر واپس نہیں آتا

یہ سب جانتے ہیں کہ کوئی مرکر زندہ نہیں ہوتا۔ شاعر کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کے مکروہات اس قابل نہیں کہ کوئی شخص اس کو ایک دفعہ

دیکھکر دوبارہ دیکھنا چاہے اس لئے جو شخص دُنیا سے جاتا ہے پھر واپس نہیں آتا۔
قوت تخئیل ایک چیز کو سو سو دفعہ دیکھتی ہے اور ہر دفعہ اسکو اس میں ایک نیا کرشمہ نظر آتا ہے پھول کو تم نے سیکڑوں بار دیکھا ہوگا اور ہر دفعہ تم نے صرف اس کی رنگ و بو سے لُطف اوٹھایا ہوگا۔ لیکن شاعر قوت تخئیل کے ذریعہ سے ہر بار نئے نئے پہلو سے دیکھتا ہے اور ہر دفعہ اسکو نیا عالم نظر آتا ہے۔
اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ تخئیل کے لئے معلومات و مشاہدات کی ضرورت نہیں یا ہے تو بہت کم کیونکہ تخئیل کا عمل واقعی موجودات پر موقوف نہیں وہ خیالی باتوں سے ہر قسم کا کام لے سکتی ہے۔ اسکی عمارت کے لئے محالات کا مصالحہ اسی طرح کام آسکتا ہے جس طرح ممکنات کا۔ وہ ایک چھوٹی سی چیز سے سیکڑوں ہزاروں خیال پیدا کر سکتی ہے چنانچہ ان شعرا نے جنھوں نے واقعات یا مشاہدات کو ہاتھ نہیں لگایا خیالات کو گوناگوں عالم پیدا کر دیا۔ جلالؔ اسیرؔ زلالیؔ شوکتؔ بخاری بیدلؔ ناصر علیؔ وغیرہ نے صرف گل و بلبل سے دیوان تیار کر دئے اور شاعری کو چمنستان خیال بنا دیا + + ہم کو اس سے انکار نہیں کہ ایک معمولی سے معمولی چیز پر قوت تخئیل مدتوں صرف کی جا سکتی ہے اور سیکڑوں مضامین پیدا کئے جا سکتے ہیں جس کی محسوس مثال متاخرین کی نکتہ آفرینیاں ہیں لیکن اسکی مثال سرکس کے گھوڑے کی ہے جو ایک خیمہ کے اندر طرح طرح کے تماشے دکھا سکتا ہے لیکن طے منازل

ہیں میدان جنگ میں گھوڑدوڑ میں کام نہیں آسکتا۔ اسی طرح تخئیل کا عمل بھی ایک محدود دائرہ میں جاری رہ سکتا ہے لیکن اس کی وسعت کیا ہوگی؟ اور ایسی شاعری کس کام آئیگی؟ وہ شاعری جو ہر قسم کے جذبات کا آئینہ بن سکتی ہو جو فطرت انسانی کا راز کھول سکتی ہو جو تاریخی واقعات کو دلچسپی کے منظر پر لاسکتی ہو جو فلسفہ اخلاق کے دقائق بتا سکتی ہو اس کے لئے ایسا محدود تخئیل کیا کام آسکتا ہے۔ تخئیل جس قدر قوی باریک تنوّع اور کثیر العمل ہوگی اُسی قدر اس کے لئے مشاہدات کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ جس قدر بلند پرواز طائر ہوگا اُسی قدر اس کے لئے فضا کی وسعت زیادہ درکار ہوگی۔ فردوسی نے شاہنامہ لکھا تو سیکڑوں ہزاروں مختلف واقعات لکھنے پڑے اس لئے قوت تخئیل کو پورا موقع ملا یہی سبب ہے کہ شاہنامہ میں شاعری کے تمام انواع موجود ہیں مثلاً شاعری کا ایک بڑا میدان جذبات انسانی کا اظہار ہے جذبات کے بہت سے انواع ہیں مثلاً محبت و عداوت غیظ و غضب حیرت و استعجاب رنج و غم پھر ان میں سے ایک ایک کے مختلف انواع ہیں مثلاً باپ بیٹے کی محبت بھائی بھائی کی محبت ماں بیٹے کی محبت زوجہ شوہر کی محبت اہل وطن کی محبت فردوسی کو یہ تمام مواقع ہاتھ آئے اور ہر موقع پر وہ تخئیل سے کام لے سکا چنانچہ اس نے جس جذبہ کا جہاں پر اظہار کیا ہے تخئیل کے عمل سے موثر اور جاں گداز کردیا ہے۔

تخئیل کے بے اعتدالی | شعر کی اس سے زیادہ کوئی بدقسمتی نہیں کہ تخئیل کا
بے جا استعمال کیا جائے۔ طبیعات کے متعلق جسطرح یونانی حکماء کی قوتیں بیکار
گئیں اور آجتک ان کے پیرو ہیولی اور صوۃ کی فضول بحثوں میں اُلجھکر کائنات
کا ایک عُقدہ بھی حل نہ کرسکے بعینہ ہمارے متاخرین شعراء کا یہی حال ہوا انکی
قوت تخئیل قدما سے زیادہ ہے لیکن افسوس بالکل رایگاں صرف کیگئی ایک شاعر کہتا ہے۔

گوشہارا آشیان مُرغ آتش خوار کرد　　برق عالم سوز یعنی شعلۂ غوغائے من

اس شعر کے سمجھنے کے لئے امور ذیل کو پہلے ذہن نشین کرلینا چاہئے۔

(۱) مُرغ آتش خوار ایک پرند ہے جو آگ کھاتا ہے (۲) آہ اور فریاد میں
چونکہ گرمی ہوتی ہے اس لئے آہ و فریاد کا شعلہ سے تشبیہہ دیتے ہیں (۳) مُرغ
آتش خوار وہاں رہتا ہے جہاں آگ ہوتی ہے شاعر کہتا ہے کہ میری فریاد
میں اس قدر گرمی ہے کہ کانوں میں پہونچی تو وہاں آگ پیدا ہوگئی اس بنا
پر مُرغ آتش خوار نے لوگوں کے کانوں میں جاکر گھونسلے بنالئے ہیں کہ یہاں
آگ نصیب ہوگی۔

متاخرین کی اکثر نکتہ آفرینیاں اسی قسم کی ہیں جسکی وجہ یہی ہے کہ قوت
تخئیل کا استعمال بے جا طور سے ہوا ہے + + +

تشبیہہ و استعارہ | یہ چیزیں شاعری بلکہ عام زبان آوری کے خط و خال میں
جن کے بغیر انشا پردازی کا جمال قائم نہیں رہ سکتا ایک عامی ہیں علمی بھی جب

جوش و غیظ و غضب میں لبریز ہو جاتا ہے تو جو کچھ اسکی زبان سے نکلتا ہے استعارات کا قالب بدل کر نکلتا ہے۔ غم و رنج کی حالت میں انشا پردازی اور تکلّف کا کسکو خیال ہو سکتا ہے لیکن اس حالت میں بھی بے اختیار استعارات زبان سے ادا ہوتے ہیں مثلاً کسی کا عزیز مر جاتا ہے تو کہتا ہے "سینہ پھٹ گیا" "دل میں چھید پڑ گئے" "آسمان ٹوٹ پڑا" "تجھ کو کسکی نظر کھا گئی"۔ یہ سب استعارے ہیں اس سے ظاہر ہو گا کہ استعارہ دراصل فطری طرز ادا ہے۔ لوگوں نے بے اعتدالی سے تکلّف کی حد تک پہونچا دیا + + +

تشبیہ کی تعریف | اگر ہم یہ کہنا چاہیں کہ فلاں شخص نہایت شجاع و بہادر ہے تو اگر انھیں لفظوں میں اس مضمون کو ادا کریں تو یہ معمولی طریقہ ادا ہے۔ اسی بات کو اگر یوں کہیں کہ "وہ شخص شیر کے مثل ہے" تو یہ تشبیہ ہو گی اور معمولی طریقہ کے بہ نسبت کلام میں کچھ زیادہ زور پیدا ہو جائے گا اگر یوں کہیں کہ "وہ شخص شیر ہے" تو زور اور بڑھ جائیگا لیکن اگر اس شخص کا مطلق خیال نہ کیا جائے اور یوں کہا جائے کہ میں نے ایک شیر دیکھا اور اس سے مراد وہی شخص ہو تو استعارہ ہے اسی مطلب کے ادا کرنے کا ایک اور طریقہ ہے کہ شیر کا نام بھی نہ لیا جائے بلکہ شیر کے جو خصائص ہیں اُس شخص کی نسبت استعمال کئے جائے کہ وہ جب میدان جنگ میں ڈکارتا ہوا نکلا تو ہل چل پڑ گئی (ڈکارنا خاص شیر کی آواز کو کہتے ہیں) یہ بھی استعارہ ہے اور پہلے طریقہ کے نسبت زیادہ [illegible]

جدت و لطف ادا | شاعری کے لئے یہ سب سے مقدم چیز ہے بلکہ بعض اہل فن کے نزدیک جدت ادا ہی کا نام شاعری ہے۔ ایک بات سیدھی طرح سے کہی جائے تو ایک معمولی بات ہے۔ اسی کو اگر جدید انداز اور نئے اسلوب سے ادا کر دیا جائے تو یہ شاعری ہے۔

ایک دفعہ حجاج نے ایک بدو سے پوچھا تم سے کوئی راز کی بات کہی جائے تو تم اس کو چھپا سکتے ہو اس نے کہا کہ "میرا سینہ راز کا مدفن ہے" یعنی راز سینہ میں مر کر رہ جاتا ہے۔ سینہ سے نکل کیونکر سکتا ہے اس بات کو اگر وہ یوں ادا کرتا کہ "میں راز کو کسی حالت میں کبھی ظاہر نہیں کرتا"، تو معمولی بات ہوتی لیکن طرز ادا کے بدل دینے نے ایک خاص لطف پیدا کر دیا اور اب وہی بات شعر بن گئی شاعری انشا پردازی بلاغت ان تمام چیزوں کی جادوگری اسی جدت ادا پر موقوف ہے + + +

حسن الفاظ | اہل فن کے دو گروہ بن گئے ہیں ایک لفظ کو ترجیح دیتا ہے اور اسکی تمام تر کوشش الفاظ کی حسن و خوبی پر مبذول ہوتی ہے۔ عرب کا اصلی انداز یہی ہے۔ بعض لوگ مضمون کو ترجیح دیتے ہیں اور الفاظ کی پروا نہیں کرتے یہ ابن الرومی اور متنبی کا مسلک ہے۔

"لیکن زیادہ تر اہل فن کا یہی مذہب ہے کہ لفظ کو مضمون پر ترجیح ہے وہ کہتے ہیں کہ مضمون تو سب پیدا کر سکتے ہیں لیکن شاعری کا معیار

کمال یہی ہے کہ مضمون ادا کن الفاظ میں کیا گیا ہے؟ اور بندش کیسی ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ شاعری یا انشا پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ ہی پر ہے۔ گلستاں میں جو مضامین اور خیالات ہیں ایسے اچھوتے اور نادر نہیں لیکن الفاظ کی فصاحت اور ترتیب اور تناسب نے ان میں سحر پیدا کر دیا ہے انھیں مضامین اور خیالات کو معمولی الفاظ میں ادا کیا جائے تو سارا اثر جاتا رہے گا۔ ظہوری کا ساقی نامہ نازک خیال موشگافی اور مضمون بندی کا طلسم ہے لیکن سکندر نامہ کا ایک شعر پورے ساقی نامہ پر بھاری ہے اسکی وجہ یہی ہے کہ ساقی نامہ میں الفاظ کی وہ متانت اور شان وشوکت اور بندش کی وہ پختگی نہیں جو سکندر نامہ کا عام جوہر ہے۔ حافظ کا شعر ہے۔

گفتم ایں جام جہاں بیں بہ تو کی داد حکیم ۔۔۔۔ گفت آں روز کہ ایں گنبدِ مینائی کرد

جو خیال اس شعر میں ادا کیا گیا ہے اسکو الفاظ بدل کر ادا کرو شعر خاک میں مل جائیگا۔ ذیل کے دونوں مصرعوں میں۔

ع ۔۔۔ تھا بلبلِ خوشگو کہ چہکتا ہے چمن میں
ع ۔۔۔ بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

مضمون بلکہ بعض الفاظ تک مشترک ہیں پھر بھی زمین آسمان کا فرق ہے
اس تقریر کا یہ مطلب نہیں کہ شاعر کو صرف الفاظ سے غرض رکھنی چاہیئے اور معنی سے بالکل بے پروا ہو جانا چاہیئے بلکہ مقصد یہ ہے کہ

مضمون کتنا ہی بلند اور نازک ہو لیکن اگر الفاظ مناسب نہیں ہیں تو شعر میں کچھ تاثیر نہ پیدا ہو سکے گی اس لئے شاعر کو یہ سوچ لینا چاہئے کہ جو مضمون اسکے خیال میں آیا ہے اُسی درجہ کے الفاظ اس کو میسّر آسکیں گے یا نہیں؟ اگر نہ آسکیں تو اس کو بلند مضامین چھوڑ کر اُنھیں سادہ اور معمولی مضامین پر قناعت کرنی چاہئے جو اس کے بس کے ہیں اور جنکو وہ عمدہ پیرایہ اور عمدہ الفاظ میں ادا کر سکتا ہے کسی نے نہایت سچ کہا ہے۔

براے پاکی لفظے شبے بروز آرد کہ مُرغ و ماہی باشند خفتہ او بیدار

یعنی "شاعر ایک ایک لفظ کی تلاش میں رات رات بھر جاگتا رہ جاتا ہے جب کہ مُرغ اور مچھلیاں تک سوتی ہیں" یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک عمدہ سے عمدہ خیال عمدہ سے عمدہ مضمون عمدہ سے عمدہ نظم اس وجہ سے برباد ہو جائے کہ اسمیں صرف ایک لفظ اپنے درجہ سے گر گیا۔

مبالغہ

جن لوگوں نے کذب اور مبالغہ کو شعر کا زیور قرار دیا ہے انکی غلطی کی وجہ یہ ہوئی کہ کذب و مبالغہ میں تخئیل کا استعمال کرنا پڑتا ہے مثلاً اگر گھوڑے کی نسبت یہ کہا جائے کہ وہ ایک منٹ میں ایک کرور کوس طے کر لیتا ہے تو شعر بالکل بے مزہ اور مہمل ہو گا۔ اس لئے جب کوئی شاعر اس قسم کا مبالغہ کرنا چاہے گا تو ضرور ہے کہ تخئیل سے کام لے مثلاً ایک شاعر کہتا ہے۔

روبرو سے اگر آئینہ کے اس گلگوں کو — پھینک دے لے کے کبھی شرق سے تو غرب تلک
اتنے عرصہ میں پھر آئے تو اُسے باور کر — عکس بھی آئینہ سے ہونے نہ پائے منفک

اس سے ظاہر ہوگا کہ مبالغہ میں کوئی حُسن پیدا ہوتا ہے تو تخیئل کی
بنا پر ہوتا ہے نہ اس لئے کہ وہ جھوٹ اور مبالغہ ہے۔

شاعری سے اگر صرف تفریح خاطر مقصود ہو تو مبالغہ کام آسکتا ہے
لیکن وہ شاعری جو ایک طاقت ہے جو قوموں کو زیر وزبر کر سکتی ہے
جو مُلک میں ہل چل ڈال سکتی ہے جس سے عرب قبائل میں آگ لگا
دیتے تھے۔ جس سے توجہ کے وقت در و دیوار سے آنسو نکل پڑتے تھے۔
وہ واقفیت اور اصلیت سے خالی ہو تو کچھ کام نہیں کر سکتی تم نے تاریخ
میں پڑھا ہوگا کہ جاہلیت میں ایک شعر ایک معمولی آدمی کو تمام عرب
میں روشناس کر دیتا تھا بخلاف اس کے ایران کے شعرا نے جن
ممدوحوں کی تعریف میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دئے ان کا نام بھی
کوئی نہیں جانتا اسکی یہی وجہ ہے کہ شعرائے جاہلیت کے کلام میں
واقفیت ہوتی تھی اس لئے ان کا واقعی اثر ہوتا تھا ایرانی شعرا باتوں
کے طوطے مینا بناتے تھے جس سے دم بھر کی تفریح ہو سکتی تھی باقی ہیچ۔

شعر کیوں اثر کرتا ہے اس مضمون کے دل نشیں ہونے سے پہلے یہ نکتہ سمجھنا
چاہئے کہ انسانی معاشرت کی کل فلسفہ اور سائنس سے نہیں بلکہ جذبات سے

چل رہی ہے فرض کرو ایک بڈھے شخص کا بیٹا مرگیا ہے اور لاش سامنے
پڑی ہے یہ شخص اگر سائنس سے رائے لے تو یہ جواب ملے گا کہ ایسے اسباب
جمع ہوگئے جن کی وجہ سے دوران خون یا دل کی حرکت بند ہوگئی اسی کا
دوسرا نام مرنا ہے یہ ایک مکانک واقعہ ہے جو ناگُریز وقوع میں آیا اور
چونکہ دوبارہ زندہ ہونے کی کوئی تدبیر نہیں اسی لئے رونا دھونا بیکار بلکہ ایک
حماقت کا کام ہے لیکن کیا تمام عالم میں ایک شخص کا بھی اس پر عمل ہے؟
کیا خود سائنس داں اس اصول سے کام لے سکتا ہے؟ بچوں کا پیار ماں
کی مامتا محبت کا جوش غم کا ہنگامہ موت کا رنج ولادت کی خوشی کیا ان
چیزوں کو سائنس سے کوئی تعلق ہے؟ لیکن اگر یہ چیزیں مٹ جائیں
تو دفعتاً سناٹا چھا جائیگا اور دنیا قالب بے جان شراب بے کیف گل بے
رنگ گوہر بے آب ہوکر رہ جائے گی۔ دُنیا کی چہل پہل رنگینی دلاویزی دلفریبی
سائنس کی وجہ سے نہیں بلکہ انسانی جذبات کی وجہ سے ہے جو عقل کی حکومت
سے قریباً آزاد ہے۔

شاعری کو جذبات ہی سے تعلق ہے اس لئے تاثیر اس کا عنصر ہے
شاعری ہر قسم کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے اس لئے رنج خوشی
جوش استعجاب حیرت میں جو اثر ہے شعر میں بھی وہی اثر ہوتا ہے۔ مصوری
شاعری اس لئے دل پر اثر کرتی ہے کہ جو مناظر اثر انگیز ہیں شاعری انکو

پیش نظر کر دیتی ہے۔ باد سحر کے جھونکے آب رواں کی رفتار پھولوں کی شگفتگی غنچوں کا تبسم سبزہ کی لہلہاہٹ خوشبوؤں کی لپٹ۔ بادل کی پھوار بجلی کی چمک۔ یہ منظر آنکھ کے سامنے ہو تو دل پر وجد کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔ شاعری ان مناظر کو بعینہ پیش کر دیتی ہے اس لئے اس کی تاثیر سے کیونکر انکار ہو سکتا ہے
شاعری صرف محسوسات کی تصویر نہیں کھینچتی بلکہ جذبات اور احساسات کو بھی پیش نظر کر دیتی ہے اکثر ہم خود اپنے نازک اور پوشیدہ جذبات سے واقف نہیں ہوتے یا ہوتے ہیں تو ایک دھندلا دھندلا نقش نظر آتا ہے۔ شاعری ان پس پردہ چیزوں کو پیش نظر کر دیتی ہے۔ دھندلی چیزیں چمک اُٹھتی ہیں مٹا ہوا نقش اُجاگر ہو جاتا ہے کھوئی ہوئی چیز ہاتھ آجاتی ہے۔ خود ہماری روحانی تصویر جو کسی آئینہ کے ذریعہ سے ہم نہیں دیکھ سکتے شعر ہم کو دکھا دیتا ہے۔

دُنیا کا کاروبار جس طرح چل رہا ہے اسکا اصلی فلسفہ خود غرضی اور اصول معاوضہ ہے اور جب اس کو زیادہ وسعت دیجائے تو ہمارے اعمال اور افعال ایک سلسلہ داد ستد بنجاتے ہیں۔ بچوں کی ہمت اور پرداخت اسلئے ہے کہ وہ آیندہ چل کر ہمارے کام آئیں گے باپ کی اطاعت اس کے پچھلے احسانات کا معاوضہ ہے۔ مہمان نوازی اس اُصول پر ہے کہ ہم کو بھی کبھی مہمان ہونے کی ضرورت پیش آئیگی قومی کام اس لئے کئے جاتے

ہیں کہ واسطہ در واسطہ خود کرنے والے کو اس سے فائدہ پہونچتا ہے۔

اس فلسفے سے بے شبہ عمل کی قوت بڑھجاتی ہے تجارت کو ترقی ہوتی ہے کاروبار وسیع ہو جاتے ہیں۔ دولت کی بہتات ہو جاتی ہے لیکن تمام جذبات مر جاتے ہیں دل مُردہ ہو جاتا ہے لطیف اور نازک احساسات فنا ہو جاتے ہیں عشق و محبت برباد ہو جاتے ہیں اور تمام دُنیا ایک بے حس کل بن جاتی ہے جو خود غرضی کی قوت سے چل رہی ہے اسحالت میں شعر شریفانہ جذبات کو تر و تازہ کرتا ہے وہ محسوسات کے دائرہ سے نکال کر ہم کو ایک اور وسیع اور دلفریب عالم میں لے جاتا ہے وہ ہم کو بے غرض اور بے لاگ دوستی کی تعلیم کرتا ہے وہ ہم کو سچّی خوشی اور سچی مسرت دلاتا ہے جب کہ کاروبار کے ہجوم مقابلہ کی کشمکش معاملات کی الجھن ترددات کی دار و گیر سے دل بالکل ہمّت ہار دیتا ہے تو شعر مجسم سکون اور اطمینان بن کر ہمارے سامنے آتا ہے اور کہتا ہے۔

شراب تلخ دہ ساقی کہ مرد افگن بود زورش
کہ تا لختے بیاسایم ز دُنیا و شر و شورش

جب کہ سائنس اور مشاہدات کی ممارست ہم کو سخت دل اور کٹر بنا دیتی ہے اور تمام معتقدات اور مسلمات عامہ کی دل میں حقارت پیدا ہو جاتی ہے کسی بات پر اعتبار نہیں آتا کسی چیز کا اثر نہیں رہتا مادہ کے

سوا تمام چیزوں کی حکومت دل سے اُٹھ جاتی ہے اسوقت شاعری ہمارے دل کو رقیق اور نرم کرتی ہے جس سے تسلیم اثر پذیری اور اعتقاد پیدا ہوتا ہے مادیت کے بجاے روحانیت قائم ہوتی ہے وہ ہم کو عالم تخئیل میں لے جاتی ہے جہاں تھوڑی دیر کے لئے مشاہدات کی بے رحم حکومت سے ہم کو نجات مل جاتی ہے۔

جب کہ دولت اور امارت کی سحر کاریاں ہمارے دل کو رشک حسرت سے بھر دیتی ہیں۔ سلاطین اور امراء کی نظر فروز زندگی ہمارے دل پر رشک کے چرکے لگاتی ہے اسوقت ہاتف غیب کی یہ آواز آتی ہے۔

بس کن زکبر و ناز کہ دیدہ ست روزگار
چینِ قباے قیصر و طرفِ کلاہ کے

پنڈت برج نراین چکبست[1] لکھنوی

پیدائش فیض آباد ۱۸۸۲ء

بزرگوں کا وطن لکھنؤ ہے آپ ۱۸۸۲ء بمقام فیض آباد پیدا ہوئے لیکن چند ہی سال بعد لکھنؤ چلے آئے اور وہیں آپ نے تعلیم پائی۔ کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد قانون کا امتحان دیا اور اب لکھنؤ میں وکالت کرتے ہیں شاعری کا شوق صغرسنی سے ہے شاید پہلی غزل نو برس کی عمر میں کہی تھی اس زمانہ سے آپ برابر شعر کہتے ہیں مگر شعر کہنے سے زیادہ آپ کو اساتذہ کا کلام پڑھنے کا شوق ہے۔ غالب۔ آتش اور انیس کے کلام کے پنڈت صاحب موصوف شیدا ہیں اور آپ کی غزل پر آتش اور مسدس پر انیس کی تقلید کا اثر نمایاں ہے۔ خیالات ضرور مختلف ہیں مگر سلاست زبان بندش الفاظ اور حسن ترکیب میں انھیں استادوں کی پیروی ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ محض نئے خیالات کا نظم کر دینا شاعری نہیں ہے آپ کی یہ کوشش ہے کہ نئے خیالات ضرور

---

[1] چکبست عرف ہے تخلص نہیں ہے۔

نظم کئے جائیں مگر زبان اور اسلوب بیان سے لطافت اور پاکیزگی کا جوہر نہ جاتا رہے کیونکہ زبان میں الفاظ کی بندش سے صناعی کرنا تصنع نہیں) شاعری کا جزو اعظم ہے۔اس خیال کا اثر آپ کی غزلوں میں بھی موجود ہے۔

پنڈت برج نراین صاحب کو نثر لکھنے کا بھی شوق ہے آپ کے مضامین جو کشمیر درپن زمانہ اور ادیب میں شایع ہوئے ہیں زیادہ تر ادبی تنقید سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً دیا شنکر نسیم۔ رتن ناتھ سرشار داغ۔ ایک یادگار مشاعرہ وغیرہ۔ ادبی تنقید اُردو داں حضرات کے لئے ایک بالکل نئی چیز ہے یہاں دلی اور لکھنؤ کی رقابت اور آتش و ناسخ اور انیس و دبیر کی معرکہ آرائیوں کا بازار گرم تھا مگر اصلی تنقید کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پنڈت برج نراین صاحب چکبست نے تنقید کا نہایت صحیح اور اعلیٰ معیار مدنظر رکھا ہے اور آپ کے مضامین زبان کی متانت اور شگفتگی کے لحاظ سے اُردو نثر کے نہایت عمدہ نمونے ہیں۔

تاریخ

ماخوذ از رسالۂ تہذیب

تاریخ ہے معلّم و باہوش با خبر ہو اس کے مدرسہ میں اگر ایک دم گزر
مضموں ملیں وہ جس سے ہو روشن دلِ بشر عالم جہاں کا اور ہی آنے لگے نظر

اُٹھے نقاب دیدۂ وہم و خیال سے
ماضی زیادہ صاف نظر آئے حال سے

تاریخ عُقدہ ہائے سلف کی کلید ہے رشتہ یہی میانِ قریب و بعید ہے
جس کو کہ ہم سمجھتے ہیں وضع جدید ہے اس کی لباس کُہنہ سے قطع و برید ہے

تاریخ حال اہلِ سلف کی گواہ ہے
غافل کے واسطے سبقِ انتباہ ہے

(پنڈت بشن نرائن در۔ آبر)

موجودہ تہذیب کا یہ ایک علمی اصول ہے کہ دُنیا میں جس قدر رسم و رواج یا علوم و فنون ہیں وہ ایک سلسلہ وار ترقی سے ظہور میں آئے ہیں فنِ تاریخ بھی اس حالت سے مستثنیٰ نہیں ہے ابتدائے آفرینش سے موجودہ زمانہ تک یہ فن مختلف تہذیبوں کے مختلف سانچوں میں ڈھلتا چلا آیا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جب انسان کو دُنیا میں آئے ہوئے بہت کم دن گزرے تھے قدرت کے کارخانے

اس کے لئے معمے سے کم نہ تھے اس عالم حیرت میں اس کے نگاہوں
کے سامنے جو حیرت انگیز نقشے گزرتے تھے وہ اس کے دل پر عجب اثر
پیدا کرتے تھے۔ مثلاً وہ دیکھتا تھا کبھی دن بڑے ہوتے ہیں کبھی راتیں
کبھی چاند سورج سیاہی میں چھپ جاتے ہیں۔ کبھی سردی زور شور کے
ساتھ اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ کبھی گرمی کے موسم کی تپش حد سے زیادہ
ترقی کر جاتی ہے۔ شروع شروع میں وہ قدرت کے کارخانوں میں کوئی
انتظام یا ترتیب نہیں پاتا تھا ان انقلابات سے متاثر ہو کر وہ دُنیا کی کیفیت
تشبیہوں اور استعاروں کے رنگ میں ایک شاعرانہ طرز پر بیان کرتا تھا۔ اب
بھی جو وحشی قومیں باقی ہیں ان کی گفتگو تشبیہہ اور استعارے کے پیرائے میں
ہوا کرتی ہے۔ مثلاً اگر کسی وحشی کو یہ کہنا ہو گا کہ فلاں شخص میرا ہمسایہ ہے
تو وہ یہ کہے گا کہ اس کے گھر کی پتیاں میرے گھر میں اُڑ کر آتی ہیں۔ چنانچہ
زمانہ گذشتہ میں بھی وحشی قوموں کا یہی رنگ تھا اس قسم کے گیت یا نظمیں
ہر مُلک اور ہر قوم کی تاریخ میں موجود ہیں جن میں وہ خیالات پائے جاتے
ہیں جو کہ انسان کے دل میں ابتدائی تہذیب میں پیدا ہوئے ہوں گے۔
مثلاً سیّاروں کو ایک قسم کا دیوتا مانتا ہے۔ دریاؤں اور پہاڑوں کی عظمت
و شوکت سے متاثر ہو کر اُن کی پرستش کرتا ہے اور جب اس کے جذبات
دلی جوش میں آتے ہیں تو وہ اُن خیالات کو شاعرانہ طرز پر ادا کرتا ہے

جو کہ نظموں یا گیتوں کی شکل میں یاد رہ جاتے ہیں اور آیندہ نسلوں کو ایک ایسی تاریخ کا کام دیتے ہیں جس سے اس وقت کی تہذیب و ترقی کی حالت آئینہ وار نظر آتی ہے۔ ایسی نظموں وغیرہ کو جن کو انگریزی زبان میں مائی تھالوجی کہتے ہیں خلاف عقل انسانی جان کر بالکل بے وقعت نہیں سمجھنا چاہئے ان سے کامل طور پر تاریخی واقعات کی تشریح نہیں ہوتی ہے لیکن اس وقت کی تہذیب کا بحیثیت مجموعی اندازہ ہو سکتا ہے جس وقت کہ نظمیں تصنیف ہوئی تھیں اور یہ ایسی تحقیقات ہے جو کہ تاریخی تحقیقات کی حد سے کسی حالت میں باہر نہیں ہے اس موقع پر یہ کہنا ضروری ہے کہ تاریخی صراحت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو خارجی واقعات کی تصریح ہے جو کہ موجودہ سائنس کے اصولوں پر مبنی ہے۔ دوسرے جذبات انسانی کی توسیع و ترقی کی تشریح ہے فن تاریخ کے ابتدائی کارناموں سے ہم خارجی واقعات کی تصریح عمل میں نہیں لا سکتے لیکن اس وقت کے انسانوں کے جذبات دلی اور عقائد کا رجحان نہایت آسانی سے دریافت کر سکتے ہیں اور اس قسم کے تاریخی کارنامے ایک نہایت اعلیٰ علمی ذخیرے کا کام دے سکتے ہیں یہ فن تاریخ کی ابتدائی منزل ہے۔

دوسری منزل میں اس دلچسپ فن نے ایک نئی صورت پکڑی جب کہ انسان ترقی کے میدان میں دس قدم اور آگے بڑھا۔ اس کا تجربہ وسیع ہوتا گیا۔ دل و دماغ کی پنہاں قابلیتیں ظہور میں آئیں اس حالت میں

تاریخ صرف اُن جذبات وعقائد انسانی کی داستان نہ رہی جو کہ انسان کے
دل میں محض قدرت کے عظیم الشان کارخانے دیکھنے سے پیدا ہوئے تھے بلکہ
اس میں خارجی واقعات کو مثلاً انسانی کارناموں کو بھی دخل ہوتا گیا لیکن
یہ واقعات اصلی حالت میں نہیں بیان کئے گئے ہر روایت کے بیان میں خیالی
عظمت و شوکت کو بہت کچھ دخل رہا۔ جو عظیم الشان انسان اس دور میں پیدا
ہوئے ان کی تعریف میں بہت سی داستانیں کہی گئیں کچھ نظم میں کچھ نثر میں مگر
واقعات کی صراحت کا خیال بالکل بالائے طاق رہا۔ اس قسم کی داستانیں
پڑھنے سے ہم کو ہزاروں تاریخی واقعات معلوم ہوتے ہیں مگر جیسا کہ پیشتر
لکھا گیا ہے ہر واقعہ کے بیان میں مبالغہ کو بہت دخل ہے۔ مثلاً لڑائیوں
کی داستانیں اس طرح لکھی گئیں ہیں جنھیں عقل انسانی کبھی قابل اعتبار نہیں
مان سکتی یا اکثر عظیم الشان انسانوں کی تعریف میں مبالغہ درجۂ اعتدال سے گزر گیا
ہے۔ یورپ میں آرتھر ہرکولیز وغیرہ ایسے قدیمی تہذیب کے عظیم الشان انسانوں
کی مثالیں موجود ہیں جن کی بہادری اور روئیں تنی کی تعریف میں دریا
بہا دئے گئے ہیں۔ ہندوستان میں مہابھارت کے سور بیران کے جواب
میں ان کی بہادری کی روائیتیں جس طرز پر لکھی گئی ہیں ان سے صاف ظاہر
ہے کہ کس قدر مبالغہ آمیز ہیں مہابھارت کے ہرکولیز یعنی بھیم کی نسبت یہ روایت
تحریر ہے کہ اس نے غصہ کے عالم میں ایک بہت بڑا درخت زمین سے

اُکھاڑ کر اپنے مخالف کی طرف اس طرح کھینچ مارا جس طرح کوئی تنکا اُٹھا کر پھینک دے
گو بادی النظر میں یہ واقعہ خلاف قانون قدرت معلوم ہو لیکن اصل میں یہ
ایک بہادر اور قوی ہیکل شخص کی بہادری اور روئیں تنی کی مبالغہ آمیز تعریف
ہے اس اصول کو پیش نظر رکھ کر ہم اگر اس قسم کی حکایتوں کا مطالعہ کریں تو
ہم بہت کچھ تاریخی واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے
کہ مبالغہ پسندی کی وجہ کیا ہے حقیقت حال یہ ہے کہ دنیا میں بڑے بڑے
لوگوں کی نسبت مبالغہ آمیز روائیتیں مشہور ہو جاتی ہیں اور جس قدر زمانہ گزرتا
جاتا ہے اس ذخیرہ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جن خلاف قدرت کرشموں
کا اُنھوں نے اپنی زندگی میں کبھی دعویٰ نہیں کیا اُنھیں کا وہ مجموعہ بتلائے
جاتے ہیں مثلاً ہندوستان میں گوتم بدھ نے کبھی اوتار ہونے کا دعویٰ
نہیں کیا بُت پرستی کے خلاف اس نے وعظ کہا لیکن برہمنوں نے ایک
پران بنا کر اس کو اوتار کا اعزاز بخشا ہے اور اس کے مریدوں نے اسکے
مرنے کے بعد اس کا بُت پوجنا شروع کر دیا ہے۔ ع

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

یا شیواجی کی مثال بہت نزدیک زمانہ کی مثال ہے یہ سب
جانتے ہیں کہ شیواجی انسان تھا اس کے وقت کی قابل اعتبار تاریخ
موجود ہے لیکن مہاراشٹ میں ایک فرقے کا یہ عقیدہ ہے کہ شیواجی شیو کا

اوتار تھا اور اس کی پیدائش ایک معجزہ کے ذریعہ سے ظہور میں آئی تھی
ان واقعات پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان میں چونکہ عظمت
وشوکت کی قدر کرنے کے جذبات قدرتی طور پر موجود ہیں اس وجہ سے
مبالغہ آمیز روایتیں بڑے بڑے آدمیوں کی نسبت مشہور ہو جاتی ہیں۔
یہاں تک کہ اکثر ان کی پرستش ہونے لگتی ہے۔ ابتداے تہذیب میں
چونکہ یہ جذبات نہایت زور شور کے ساتھ انسان کے دل میں پائے جاتے
تھے اور اس عقیدہ غائبانہ روحانی قوتوں میں تھا۔ لہٰذا اس زمانہ میں
جو عظیم الشان انسان گزرے اُن کے مداحوں نے اُن کو آسمان پر چڑھا
دیا اور اُن کی تعریف میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ
مبالغہ پسندی کو عیب نہیں سمجھتے تھے اُن کے نزدیک یہ ایک قسم کی عزت
تھی کہ بڑے آدمیوں کی صفت میں مبالغہ سے کام لیا جاوے نیز وہ
یہ سمجھتے تھے کہ بزرگوں کے کارناموں پر جس قدر خیالی تعریف کی وارنش
کی جائے زیبا ہے۔ لہٰذا جب ہم اس قسم کی روایتیں پڑھیں تو ہم کو
اس امر کا خیال لازمی ہے کہ ہم اصلی واقعات بجنسہ نہیں پڑھ رہے
ہیں بلکہ ان واقعات کی وہ تصویر دیکھ رہے ہیں جس میں کہ بہت کچھ
مبالغہ کا رنگ بھرا ہوا ہے یہ فن تاریخ کی دوسری منزل کی حالت
ہے۔ تیسری منزل کی سیر کا راستہ بہت کچھ صاف ہے یہ وہ زمانہ ہے

جبکہ انسان کو تاریخ کی غرض سے تاریخ لکھنے کی حس پیدا ہوئی ابھی تک اس کا منشا محض جذبات دلی کا اظہار تھا یا بزرگوں کی عظمت کرنا نہ کہ تاریخ کی غرض سے تاریخ لکھنا۔ اب وہ زمانہ آیا کہ جب اُس نے گزشتہ و موجودہ واقعات کو یکجا جمع کرنا شروع کیا لیکن یاد رہے کہ اس وقت تک تاریخ نویسی کا مذاق تکمیل پر نہیں پہونچ گیا تھا۔ اُس زمانہ کی تاریخیں محض واقعات کی فہرستیں ہیں نہ کہ ملک اور سوسائٹی کی حالت فلسفانہ تفسیر نیز اس وقت تک مبالغہ کو تاریخی واقعات لکھنے میں بہت کچھ دخل تھا ہراڈوٹس یورپ کا اس رنگ کا پہلا باقاعدہ مورخ ہے اس نے اپنی تاریخ میں اکثر واقعات لکھے ہیں جو مبالغہ سے پُر ہیں یا اسی زمانہ کا ایک دوسرا مورخ ہے اُس نے صاف الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ میں نے اصلی واقعات کے علاوہ بہت کچھ اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے جیسے فردوسی نے شاہنامہ میں صاف طور پر لکھ دیا ہے ؎

منش کردہ ام رستم پہلواں ‌ ‌ ‌ ‌ وگرنہ یلے بود در سیستاں

ہندوستان میں تاریخ نویسی کا مذاق اس حد سے آگے ترقی نہ کرسکا۔ یہاں پُرانیں وغیرہ موجود ہیں جن کے پڑھنے سے تہذیب قدیم کا حال معلوم ہو سکتا ہے یا کشمیر کی تاریخ کا پتہ اَب چلا ہے لیکن کوئی باقاعدہ تاریخ تمام مُلک کی موجود نہیں اس میں شک نہیں کہ ہندوستان

کے قدیم باشندوں نے مختلف علوم و فنون میں حیرت انگیز ترقی کی تھی
جسکی ثنا و صفت میں یورپ کے محققین تر زبان ہیں لیکن فن تاریخ نے
یہاں نشو و نما نہ پائی اکثر حضرات کا یہ مقولہ ہے کہ مسلمانوں کے دوران حکومت
میں اکثر جا پر اور متعصب فرمار واؤں نے ہندوستان کی کتب تاریخی جلا
دیں مگر یہ خیال بالکل غلط ہے اور اس قابل نہیں کہ اس پر اعتبار کیا
جائے کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کی فلسفہ اور شاعری وغیرہ کا ذخیرہ تو اب
تک موجود ہے مگر تاریخی کتابیں اس انتظام کے ساتھ جلائی گئیں کہ اُنکی
خاک بھی سرمہ کے لئے نہیں ملتی۔ اصل وجہ یہ ہے کہ فن تاریخ نے اُسی
مُلک میں زیادہ نشو و نما پائی کہ جس ملک میں نظام معاشرت پولٹیکل اصولوں
پر مبنی تھا۔ ہندوستان کی حالت جداگانہ تھی یہاں نظام معاشرت کا دارومدار
محض مذہبی اصولوں پر تھا یہاں دُنیا سے زیادہ عقبیٰ کی فکر رہتی تھی اس لئے
فن تاریخ کو قابل اطمینان ترقی نہ ہوئی کیونکہ فن مذکور زیادہ تر دنیاوی
کارناموں سے تعلق رکھتا ہے۔ اب فن تاریخ کی چوتھی منزل کا حال
ملاحظہ ہو۔ جب انسان میں غور و فکر کی قابلیت نے ترقی کی اور وہ محض عادات
کا غلام نہیں رہا تو اُس نے واقعات کو صرف سرسری نظر سے دیکھنا ناپسند
کیا بلکہ اُن کی رفتار کا بحیثیت مجموعی اندازہ کرنا شروع کیا عام اسباب کے
عام نتائج اخذ کئے اور ان عام نتائج کی مدد سے چند عام اصول قائم کئے

اور ان عام اصولوں کو پیش نظر رکھ کر واقعات کی رفتار پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی۔ اس دماغی ترقی کے ساتھ نظام معاشرت کی سادگی میں بھی روز بروز فرق آتا گیا اور زندگی کی داستان پیچیدہ ہوتی گئی۔ اس حالت میں تاریخ جب لکھی گئی تو وہ محض واقعات کی فہرست نہ رہی بلکہ اُن واقعات کے اسباب و نتائج کی فلسفیانہ تشریح ہوگئی اس قسم کی تاریخ نویسی کی بنیاد یورپ میں پڑی۔ اس میں شک نہیں کہ عربی فارسی وغیرہ میں اکثر مستند تاریخیں موجود ہیں مگر ان میں صرف سلطنتوں کے کمال و زوال کی داستانیں درج ہیں مگر سوسائٹی اور مذہب وغیرہ کے پیچیدہ مسائل کا ان میں ذکر نہیں ہے۔ یورپ میں سب سے پیشتر ملک اطالیہ میں مکّے ولی نے فلسفیانہ تاریخ کی داغ بیل ڈالی۔ اس کے بعد جرمنی انگلستان وغیرہ میں ایسے مورّخ پیدا ہوئے جنھوں نے علاوہ معمولی واقعات کے سوسائٹی کے مختلف پہلوؤں پر تاریخ میں نقادانہ نظر ڈالی۔ آخر کار فرانس میں گیزو نے تاریخ تمدّن لکھ کر تمام دُنیا کو حیرت میں ڈالدیا غرضکہ رفتہ رفتہ فن تاریخ ترقی کرتا گیا اور آخر کار تجربہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ فن تاریخ شاعری اور فلاسفی کا مجموعہ ہے یعنی مورخ کامل وہی شخص ہوسکتا ہے جو کہ فلسفی کا دماغ اور مصوّر کا قلم رکھتا ہو۔ دماغ سے واقعات کا فلسفیانہ طور پر اندازہ کرے اور جادو کار قلم سے سوسائٹی کے انداز معاشرت کی

تصویر کھینچے لیکن ابھی تک غالباً یورپ میں بھی کوئی ایسا مورخ نہیں پیدا ہوا جس میں یہ دونوں وصف درجۂ کمال پر پائے جاتے ہوں بالفعل وہاں فنِ تاریخ دو حصّوں میں منقسم ہے ایک فرقہ ایسے مورخین کا ہے جس نے واقعات کی تشریح اور اُن کی فلسفیانہ تحقیقات اپنا اپنا حصّہ کرلیا ہے۔ دوسرا فرقہ تاریخی فسانہ نگاروں کا ہے۔ اس قسم کے مصنّفین زمانہ ہائے دور دراز کی سوسائٹی کے طرز معاشرت کی تصویر افسانوں کے پیرایہ میں کھینچتے ہیں جو شخص کہ پوری طور سے تاریخی واقفیت حاصل کرنا چاہے اسکے لئے ان دونوں قسم کے تصانیف کی سیر ضروری ہے ہمارے اُردو لٹریچر میں تاریخی تحقیقات کا ذخیرہ بہت کم ہے۔ یہ بھی انگریزی تہذیب و تربیت کا اثر ہے کہ اکثر بزرگوں کو تاریخ لکھنے کا شوق پیدا ہوا ہے مثلاً شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب نے اکثر تاریخیں لکھی ہیں مگر ان تصانیف میں اس نقادانہ لیاقت سے کام نہیں لیا گیا ہے جو کہ فن تاریخ کی شان میں داخل ہے مگر نہ ہونے سے یہ تصانیف بہتر ہیں بیشک اُردو میں ایک ایسی کتاب موجود ہے جس پر کہ سچّی تاریخ کا اطلاق ہو سکتا ہے اس کتاب کا نام دربار اکبری ہے اور اس کا لکھنے والا ہندوستان کا مشہور مصنّف محمد حسین آزاد ہے۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا — کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

دربار اکبری میں محض اکبر کے زمانہ کے محاربات وغیرہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ اکبر کے زمانہ کی سوسائٹی کا رنگ بھی دکھایا گیا ہے۔ اس نامور مصنف سے نظم اُردو کی تاریخ آبحیات کے نام سے یادگار ہے یہ تاریخ بھی اپنے رنگ میں لاجواب ہے علاوہ ان نامی مصنفین کے اکثر حضرات نے چھوٹی چھوٹی تاریخیں ہندوستان کی مختلف حصوں کی لکھی ہیں اور ایک حد تک کامیابی بھی حاصل کی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ فن تاریخ کی دوسری شاخ یعنی تاریخی فسانہ نگاری نے ابھی کچھ نشو ونما نہیں پائی۔ یوں تو ایسے فسانہ نگاروں کا ایک فرقہ پیدا ہو گیا ہے جو اپنے تئیں تاریخی فسانہ نگار سمجھتے ہیں مگر ابھی تک ایک بھی ایسا مصنف نہیں پیدا ہوا ہے۔ جو کہ واقعی تاریخی فسانہ نگار کے لقب کا مستحق ہو۔ میری نظر سے اکثر فسانے گزرے ہیں جن کی لوح پر لکھا ہوا تھا "کہ تاریخی فسانہ ہے" مگر ایک فسانہ کے پڑھنے سے بھی اس زمانہ کے سوسائٹی کے طرز معاشرت کا پتہ نہیں چلتا تھا جس زمانہ کا اُن فسانوں میں ذکر تھا۔ ان میں محض تاریخی واقعات درج کردئے گئے تھے مگر اُن کے مُصنف زمانہ دیرینہ کے مردہ قالبوں میں جان نہیں ڈال سکتے تھے ایک فسانہ میں جو کہ عرب کے متعلق تھا اور جس میں کہ ہزار برس اُدھر کی تاریخ کا ذکر تھا۔ یہ واقعہ نظر سے گزرا کہ کسی شخص نے کسی کو رجسٹری کر کے خط بھیجا۔ حالانکہ عرب میں اب تک رجسٹری کا پتہ نہیں ہے ایک صاحب نے

اپنے تاریخی فسانہ میں کسی مغربی عورت کے حُسن کی تصویر میں سیاہ اور چمکدار زلفیں بھی شامل کردی ہیں۔ حالانکہ مغرب میں سنہرے اور گھونگھر والے بال ہوتے ہیں نہ کہ سیاہ اور چمکدار زلفیں۔ ایک بزرگوار نے اپنے تاریخی فسانہ میں جوکہ راجپوتانہ کی سوبرس اُدھر کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ راجہ کے محل میں مختلف آرائشوں کے علاوہ اپنے دماغ سے گیس کی روشنی بھی پیدا پیدا کردی ہے۔ حالانکہ اُس زمانہ میں گیس کی روشنی کہاں۔

اس تشریح کے بعد یہ ثابت ہوگیا کہ فن تاریخ نے کس طرح ترقی کی اور کیا کیا رنگ بدلے اور جوکچھ مَیں نے اس حدتک تحریر کیا ہے اسی میں فن تاریخ کہوں گا مذکورالصدر اصولوں کو پیش نظر رکھ کر اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو بہت سی کاوشیں رفع ہو جائیں گی مثلاً ہم پر یہ امر روشن رہے گا کہ پُرانی کتب مذہبی جنھیں کہ ہم تقویم پارینہ خیال کرتے ہیں ایک قسم کے تاریخی سرمایہ سے کم نہیں جس سے تہذیب انسانی کی ابتدائی حالت کا اندازہ ہوسکتا ہے یا مہابھارت ایلڈ آڈیسی وغیرہ ایسی تاریخی تصانیف ہیں جن میں ایسی روایتیں درج ہیں جوکہ مبالغہ سے خالی نہیں مگر جن کی اصلیت ضرور ہے۔ علاوہ بریں مطالعہ تاریخ میں ہم کو اور چند امور کا بھی خیال لازمی ہے۔ اولاً یہ کہ تاریخ پڑھنے میں ہم کو اس امر کا خیال رکھنا چاہئے کہ ہم صرف ایک کہانی یا داستان نہیں پڑھ رہے ہیں جس میں

بادشاہوں کی تخت نشینی یا مرنے جینے کے تذکرے ہیں برعکس اس کے
ہم کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ مختلف زمانوں میں انسانی اخلاق کا کیا معیار رہا ہے
جس سے کہ تہذیب کے مختلف درجوں کا اندازہ ہو سکتا ہے یا مذہبی
انقلابات پر ہم کو غور کرنا چاہیئے کہ کون کون مذہبی عقائد مختلف زمانوں
میں سوسائٹی پر حاوی رہے ہیں اور علم طبیعات کی ترقی کے ساتھ ان
عقائد میں کیا تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں اور ان مذہبی انقلابات کے ساتھ
سوسائٹی کے سوشل رسم و رواج کا کیا رنگ رہا ہے کون اصول دیرپا
ثابت ہوئے ہیں اور کن کو زمانے نے فنا کر دیا ہے اس انداز پر مطالعہ
تاریخ کرنے سے تاریخی زمانہ ہم کو محض ایک داستان غیر مسلسل نہ نظر
آئے گا بلکہ ہم پر یہ امر آئینہ ہو جائے گا کہ یہ اخلاقی مذہبی اور سوشل قوتوں
اور ان کے نتائج کا ایک ایسا سلسلہ ہے جو کہ ازل سے شروع ہوا ہے
اور ابد تک قائم رہے گا۔

دوسرا امر جس کا مطالعۂ تاریخ میں خیال لازمی ہے وہ یہ ہے کہ
ہم کو صرف بڑے بڑے واقعات کو ضروری سمجھ کر حفظ نہ کر لینا چاہیئے
محض بڑی بڑی لڑائیوں کی حکایتیں یا انقلاب عظیم کی داستانیں یاد
کر لینے سے ہم سوسائٹی کی اندرونی یا اصلی حالت کا اندازہ نہیں کر سکتے
ہیں۔ ہم کو زیادہ تر توجہ اُن واقعات پر کرنا چاہیئے جو کہ بادی النظر

میں غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں مگر جو دراصل قوم یا ملک کے اخلاق و عادات
پر اثر کرتے آئے ہیں مثلاً علمی ترقی یا جہالت کے طرف سوسائٹی کے رجحان
کا اندازہ کرنا افلاس و دولت مندی کی مختلف حالتوں پر غور کرنا نہایت
ضروری ہے۔ کیونکہ یہ ایسی پنہاں قوتیں ہیں جن سے کہ بڑے بڑے انقلاب
ظہور میں آ سکتے ہیں۔ لہذا سوسائٹی کی اصلی حالت دریافت کرنے کے
لئے محض عظیم الشان واقعات پر توجہ کرنا ضروری نہیں بلکہ ان پنہانی اخلاقی
اور علمی قوتوں پر غور و تعمق کی نظر ڈالنا چاہئے جن کے زوال و کمال کے
ساتھ ملکوں اور قوموں کے زوال و کمال کی داستانیں وابستہ رہی ہیں
اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ دین اسلام کو جو کچھ فروغ ہوا ہے وہ تلوار کے
زور سے ہوا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ عظیم الشان مذہب محض جبریہ پھیلایا
گیا ہے ایسا خیال محض تاریخ اسلام کے سطحی نظارہ سے پیدا ہو سکتا ہے
جن لوگوں نے عمیق نظر سے عروج اسلام کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے
ہیں کہ اسلام کے فروغ کی بانی ایک زبردست اخلاقی قوت تھی جو کہ
رسول عربی کی تلقین سے ظہور میں آئی تھی اور جس نے عرب کے جاہل
وحشیوں کو سرفروش اور توحید پرست مسلمان بنا دیا تھا مسلمان ایمان
پر جان و دولت قربان کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے اور یہی زبردست
قوت اخلاقی تھی جس نے اسلام کا سکہ دنیا میں جاری کر دیا۔ اسی طرح

اکثر حضرات کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان میں مرہٹوں کو جو کچھ عروج حاصل ہوا ہے وہ محض لوٹ مار کی بدولت حاصل ہوا ہے اور شیواجی محض ایک زبردست لُٹیرا تھا۔ لیکن اگر نظر غور اور انصاف سے مرہٹوں کی حیرت انگیز ترقی کی داستان پڑھی جائے تو ثابت ہو جائیگا کہ مرہٹوں کے سینوں میں حب الوطنی کی آگ روشن تھی اور وہ محض ذاتی عروج و فائدہ کے لئے نہیں لڑتے تھے بلکہ اپنے ملک پر اپنی جان قربان کرتے تھے اور یہ زبردست اخلاقی قوت شیواجی کی بہادری اور جاں نثاری سے پیدا ہو گئی تھی جن صاحبوں نے جناب راناڈے مرحوم کی وہ لاجواب کتاب پڑھی ہے جس کا نام "عروج سلطنت مرہٹہ" ہے وہ میرے اس دعوے کی تائید کرینگے۔ مُراد ان مثالوں کے پیش کرنے سے یہ ہے کہ محض بڑی بڑی انقلابی حالتوں کے ظاہری عنوان تک مطالعہ تاریخ میں نظر نہ محدود رکھنا چاہیئے۔ بلکہ ان انقلابات کے اسباب باطنی بھی تلاش کرنے چاہئیں۔ مطالعہ تاریخ میں اس بات کی بھی سخت ضرورت ہے کہ ہر واقعہ کا اندازہ تحقیق و تنقید کی نظر سے کیا جائے کیونکہ اگر کسی قسم کے تعصب سے کام لیا گیا تو واقعات کی تشریح سے کبھی قابل اطمینان نتیجہ نہیں نکل سکتا بلکہ نتائج کی صحت میں فرق آجانے سے اُلٹا سبق گمراہی کا ملتا ہے مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بالفعل ہندوستان میں تاریخی مطالعہ کے وقت بہت کچھ تعصب سے کام لیا جاتا ہے۔ یہاں

رسم و رواج دیرینہ کی پابندی کی بیڑیاں ایسی مضبوط ٹھکی ہوئی ہیں کہ ہر
پرانی بات کو عزت کی نگاہ سے دیکھنا اصول اخلاق سمجھا جاتا ہے۔ اس کا اثر
مطالعہ تاریخ پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً اکثر حضرات کا یہ شیوہ ہے کہ جب وہ قدیم
ہندوستان کی تاریخ پڑھتے ہیں تو اُن کی محض یہ غرض رہتی ہے کہ جو
واقعات کہ پُرانے ہندوؤں کے اخلاقی یا علمی اعزاز کے شاہد ہوں اُن کی
تشہیر کی جاے اور " پدرم سلطان بود" کا غلغلہ بلند کیا جاے اور اگر کسی طرح
یہ ثابت ہو جاے کہ قدیم ہندوستان میں بھی ریل اور تار برقی کا سامان
موجود تھا تو پھر کیا کہنا ہے اور جب اس وضع کے حضرات کو کسی ایسی لغزش
کا سامنا ہوتا ہے جس سے کہ ہندوستان کے قدیم باشندوں کی کسی اخلاقی
یا سوشل بدعنوانی کا ثبوت ملتا ہے تو یہ فکر پیدا ہوتی ہے کہ کسی طرح ان
واقعات پر خاک ڈالدی جاے یا اکثر بانیان اصلاح نے یہ طریقہ اختیار
کیا ہے کہ جب کسی اصلاح کی عمل میں لانے کی کوشش کرتے ہیں تو اختلاف
کی شورش سے بچنے کے لئے یہ چال چلتے ہیں کہ تاریخی واقعات کو توڑ مروڑ
کر لفظی شعبدہ پردازی سے یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ ہم کوئی بات نئی نہیں
کہتے ہیں بلکہ ایک پُرانی رسم تازہ کر رہے ہیں مثلاً ایک بزرگوار پردہ کے
خلاف ہیں۔ اُنھوں نے اپنے دلائل میں اس بے بنیاد تاریخی تصرف کو
بھی شامل کیا ہے کہ مسلمانوں میں کبھی پردہ کی رسم نہ تھی ہندوستان

میں چین سے پردہ آیا اور ہندوؤں سے مسلمانان ہند نے پردہ کی رسم سیکھی حالانکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ ایسی کوئی قابل وقعت تاریخی شہادت نہیں موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہو کہ ہندوستان نے چین سے پردہ اُڑایا اور مسلمانوں پر ابر کی طرح چھاگیا اسی طرح کی اور مثالیں موجود ہیں مگر یاد رہے کہ اصلاح قومی کی عالیشان عمارت ایسی سست بنیاد پر تیار کرنا خالی از اندیشہ نہیں ہے۔ ان خدا کے بندوں سے کوئی پوچھے کہ قومی اصلاح کی کوشش میں ایسا "دروغ مصلحت آمیز" شامل کرنے کی کیا ضرورت ہے کیا ہمارے بزرگ انسان نہ تھے؟ کیا اُن کی تہذیب فرشتوں کی تہذیب تھی کہ اس میں نقص دریافت کرنا کفر میں داخل ہے۔ ان سب باتوں کو چھوڑ کر ہمارا فرض یہ ہے کہ تاریخ کا مطالعہ تحقیق و تنقید کی نظر سے کریں جو لغزشیں اپنے بزرگوں کے نظام معاشرت میں دیکھیں ان سے عبرت حاصل کریں اور اُن کے تجربہ سے فائدہ اُٹھائیں سب سے زیادہ ضروری اصول مطالعۂ تاریخ کی نسبت یہ ہے کہ ہمیں اپنے ملک یا قوم کی تاریخ کو کل دنیا کی تاریخ سے الگ نہ سمجھنا چاہئے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے ملک یا قوم کی تاریخ اس عظیم الشان تاریخ کی ایک شاخ ہے جو کل بنی نوع انسان کی تہذیب و ترقی کی داستان ہے، اور جسکا سلسلہ زمانہ قدیم میں دور تک پہونچتا ہے۔ اگر غور سے ہم تاریخ ماضیہ پر نظر ڈالیں تو ہمپر ثابت ہو جائیگا کہ ہماری موجودہ حالت اُن ہزاروں

اخلاقی اور علمی قوتوں کی مدد سے ظہور میں آئی ہے جو کہ ابتداے آفرینش سے
اب تک مختلف ملکوں اور قوموں میں کام کرتی آئی ہیں ہزاروں دل و دماغ
تحقیقات علمی کے لئے وقف ہو گئے ہیں جنھوں نے مختلف ملکوں اور مختلف
قوموں میں مختلف زمانوں میں تہذیب کی شمع روشن رکھی ہے اور ایک مُلک
کا چراغ دوسرے ملک سے جلا ہے۔ مثلاً اُس زمانہ کی سیر کرو جبکہ وادی اندلس
میں تہذیب کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ چین میں علم و فن کی ترقی ظہور میں
آرہی تھی۔ بابل میں تہذیب اپنا ابتدائی رنگ جما رہی تھی۔ پھر اُس زمانہ کی
تصویر اپنی آنکھوں کے سامنے کھینچو جبکہ اُن مختلف تہذیبوں میں تعلقات باہمی
شروع ہوئے۔ مختلف علم و عقل کے کارنامے اور صنعت و حرفت کے نمونے
ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہونچے۔ غرضکہ اسی طور سے دُنیا روز بروز
ترقی کرتی گئی آج ہمارے سامنے تہذیب کے وسیع باغ ہیں مختلف رنگ
کے مختلف پودے اپنی اپنی بہار دکھلا رہے ہیں اور ہمارے دلوں کو سرور اور
آنکھوں کو نور بخش رہے ہیں ان میں ایسے پودے بہت کم ہیں کہ جنھوں نے
ابتداے آفرینش سے اب تک ایک ہی سرزمین کی آب و ہوا میں نشو و نما پائی
ہو برعکس اس کے ہر ایک پودا ایسا ملے گا جس میں کسی دوسرے ملک کے
پودے سے لاکر قلم لگائی گئی ہے دیکھو آج علم ہندسہ کس ترقی پر ہے اہل یورپ
نے اس میں کیا کیا باریکیاں پیدا کی ہیں اب اگر اس کے تاریخ پر غور کیا جائے

تو معلوم ہو جائے گا کہ اہل یورپ نے اہل عرب سے حاصل کیا ہے اور اسکی ایجاد کا سہرا ہندوستان کے سر ہے جہاں سے اہل عرب نے اسے سیکھا۔ ہر گھنٹہ کے ساٹھ منٹ اور ہر منٹ کے ساٹھ سکنڈ پر تقسیم اہل بابل کا ایجاد ہے۔ آتش فشاں آلات حرب کی صنعت اہل یورپ کے ساتھ مخصوص سمجھی جاتی ہے۔ مگر اصل میں اہل چین ان کے موجد ہیں کیونکہ بارود چین ہی کا ایجاد ہے۔ فن جہاز رانی آج کس ترقی پر ہے اس کے لئے بھی ایک معنی میں اہل چین کا شکریہ لازم ہے۔ کیونکہ قطب نما پہلے اُنھوں نے بنایا۔ دور کیوں جاؤ یورپ کی موجودہ تہذیب بہت کچھ اہل عرب کے احسانوں سے گرانبار ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یورپ میں پہلی یونیورسٹی مسلمانوں نے قائم کی اور مسلمانوں ہی نے پہلی رصدگاہ وہاں بنائی۔

اسی طرح اور بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ غرضکہ اس صورت پر تاریخی واقعات کا اندازہ کرنے سے یہ آئینہ ہو جاتا ہے کہ ہماری موجودہ تہذیب کل پرانی تہذیبوں کا عطر ہے اور یہ ایسا اصول ہے جو تنگ خیالی اور کم نظری کے فنا کرنے کے لئے جادو کا اثر رکھتا ہے۔ اکثر ہندو مسلمانوں کے جھگڑے "پدرم سلطان بود" کے نازیبا پر قائم ہیں۔ ہندو کہتے ہیں کہ ہم نے عادات بد مسلمانوں سے سیکھے اور مسلمان کہتے ہیں کہ ہم نے ہندوؤں کو اخلاق حسنہ سکھائے ہیں اُن سے کچھ نہیں سیکھا ہے۔ مگر دونوں فرقوں میں

جنلوگوں کی نظر وسیع اور جنلوگوں کے دماغ علم تاریخ کے نور سے روشن ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندو بہت سی خوبیوں کے لئے مسلمانوں کے احسان مند ہیں اور مسلمان ہندوؤں کے۔ جناب رانا ڈے مرحوم نے لکھنؤ میں سوشل کانفرنس کے موقع پر جو تقریر فرمائی تھی اُس میں ثابت کر دیا تھا کہ ہندوؤں نے انتظامی قابلیت اور قومی یگانگت کا اصول مسلمانوں سے سیکھا اور دماغی اور روحانی ترقی کا سبق مسلمانوں نے ہندوؤں سے لیا۔ ان واقعات پر غور کرنے سے اُن کاوشوں سے نجات مل سکتی ہے جو کہ جہل و تعصب کی وجہ سے دلوں میں پیدا ہوگئی ہیں۔

قصہ مختصر عالم تاریخ کی سیر بھی عجب روحانی سرور کا سرمایہ بہم پہونچاتی ہے اور آئینہ عقل کو جلا دیتی ہے اس عالم میں قدم رکھتے ہی تجربہ کا آفتاب نورافشاں نظر آتا ہے جس سے دل کی آنکھیں روشن ہوتی ہیں اس عالم میں تہذیب و ترقی کی وہ زبردست شاہ راہ نظر آتی ہے جس کا ایک کنارہ ازل ہے دوسرا ابد جسکی ہر منزل پہ فیض کے چشمے جاری ہیں کہیں وہ بزرگ اپنی خانقاہوں میں بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں جنھوں نے مذہب و فلسفہ کی تحقیق میں اپنی عُمر صرف کر دی ہے اور طبع نورانی ایسے چراغ روشن کر گئے ہیں جنھیں ہوائے مخالف کے جھونکے نہیں بجھا سکتے اور جنکی روشنی میں اب تک بہت سے گمراہ منزل مقصود تک پہونچ جاتے ہیں کہیں وہ بزم جادو آراستہ نظر آتی

ہے جسمیں بڑے بڑے معجز نگار نثاروں اور شاعروں کا مجمع ہے نکتہ سنجیوں کے گلدستے مہک رہے ہیں اور شراب سخن کا دور چل رہا ہے کہیں اُن قوی ہیکل اور ضیغم منش جوانوں کی پُر رعب صورتیں دکھائی دیتی ہیں جنکی چتونوں سے شجاعت کا نور برس رہا ہے اور جنکی تلواروں کے پانی سے ابتک مختلف قوموں کے اعزاز و وقار کا چمن ہرا ہو رہا ہے اسی طرح عالم تاریخ میں ہر علم و فن کے باکمال حضرات کی زیارت کا موقع ملتا ہے اور لُطف یہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ شخص عظیم الشّان انسانوں کی صحبت میں بلا تکلّف شریک ہو سکتا ہے اور اپنی قابلیت کے مطابق فیض حاصل کر سکتا ہے۔

مرزا محمد رفیع سودا

پیدائش دلی ۱۱۳۵ھ   وفات لکھنؤ ۱۱۹۵ھ

مرزا سودا کے باپ مرزا محمد شفیع کابل کے رہنے والے تھے سوداگری کے وسیلہ سے دلی آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے مرزا سودا دلی میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی پہلے فارسی میں شعر کہتے تھے مگر خان آرزو کی فہمائش سے اردو میں کہنے لگے اور اس زبان میں وہ بات حاصل کی کہ دلی اور لکھنؤ کے سخن شناسوں سے استادی کے اقرار نامے لکھوائے۔ دلی میں شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام مرزا سودا کو دکھاتے تھے۔ جب مرزا کے کلام کا شہرہ لکھنؤ تک پہونچا تو نواب شجاع الدولہ نے کمال اشتیاق سے برادرِ من مشفق مہربان من لکھ کر بلوایا مگر انھیں دلی چھوڑنا گوارا نہ ہوا اور معذرت میں ذیل کی رباعی لکھ بھیجی۔

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک   آوارہ ازیں کوچہ بہ آں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے   بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

آخر کار زمانہ کے لیل و نہار نے مرزا کو دلی چھوڑ کر لکھنؤ جانے پر مجبور کیا جہاں اس وقت فیاضی اور سخاوت کی گنگا بہ رہی تھی۔ نواب شجاع الدولہ اور ان کے بیٹے آصف الدولہ نے جیسی کچھ کہ چاہئے ان کی قدر دانی کی۔ مرزا سودا نے تقریباً

ستر برس کی عمر میں لکھنؤ میں رحلت کی۔ سودا اُردو کے مسلم الثبوت اُستاد ہیں انھوں نے قریب قریب سب اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور غزلیں قصیدے رباعیاں مستزاد قطعات تاریخیں پہیلیاں واسوخت ترجیع بند مخمس سب کچھ کہا ہے۔ خصوصاً ہجو ہیں ہر قسم کی نظم میں موجود ہیں لیکن اُردو میں قصائد کا کہنا اور پھر اس دھوم دھام سے اعلیٰ درجہ فصاحت وبلاغت پر پہونچانا ان کا پہلا فخر ہے اور شوکت الفاظ۔ بلند پروازی اور تازگی مضامین مرزا سودا کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ زبان پر اس قادر الکلام کو ایسی قدرت حاصل ہے کہ کلام کا زورمضمون کی نزاکت سے دست گریبان ہے۔ بندش اور ترکیب الفاظ ایسی کہ اگر شعر میں کوئی لفظ بھول جائیں تو اس کے بغیر شعر مزہ نہیں دیتا۔ مرزا سودا کا زمانہ وہ زمانہ تھا کہ جب اُردو زبان اپنے رنگ بدل رہی تھی اور بھاشا پر فارسی کا تصرف ہو رہا تھا اسی وجہ سے ان کے یہاں اکثر متروک الفاظ اور محاورے نظر آتے ہیں تاہم ہم کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جن اشخاص نے زبان اُردو کو پاک صاف کیا ہے اُن میں مرزا کا نمبر اوّل ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ان کا کلام قریب قریب تمام اصناف سخن میں ہے اور ہر صنف میں بہتات سے ہے اسوجہ سے سب کلام ہمپایہ نہیں ہے بعض نکتہ چیں کہتے ہیں کہ مرزا کے دفتر تصنیفات میں ردی بھی ہے اور بہت ہے اور یہ شاید ان کی پُرگوئی کا نتیجہ ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کے گلزار سخن میں ہجو کے کانٹوں کی ایسی کثرت ہے جس کی مثال کسی اور شاعر کے

یہاں نہیں ملتی۔ خوش اعتقاد اس کو ان کی شوخی اور مزاج کی گرمی پر محمول کریں گے لیکن تب بھی یہ قبول کرنا پڑیگا کہ اس صنف میں مرزا نہ صرف آئین ثقاہت بلکہ آداب شرم و حیا کی حد سے بھی بہت پرے جا پڑتے ہیں۔

غزلوں کا انتخاب

مقدور نہیں اس کی تجلّی کے بیاں کا
جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا

پردہ کو تعین کے درِ دل سے اُٹھادے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب چشم کھلی گُل کی تو موسم ہے خزاں کا

دکھلائیے لے جاکے تجھے مصر کا بازار
لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جنسِ گراں کا

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دُنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا
موسیٰ نہیں جو سیر کروں کوہ طور کا

ہم تو قفس میں آن کے خاموش ہو رہے
اے ہمصفیر فائدہ ناحق کے شور کا

سوداؔ کبھی نہ مانیو واعظ کی گفتگو
آوازۂ دہل ہے خوش آیند دور کا

وہی جہاں میں رموزِ قلندری جانے
بھبھوت تن پہ جو ملبوسِ قیصری جانے

غلام اُسکی میں ہمت کا ہوں کہ جو اپنے
جگر کے خون کو خونِ تونگری جانے

فہیم ہے وہی آفاق میں ترا جو یا
کہ جس میں پائے تجھے اُس کو بہتری جانے

زباں دہن میں تو غنچہ کے بھی ہے کیا لازم
کہ جس کے مُنہ میں زباں ہو سخنوری جانے

کسی گدا نے سُنا ہے یہ ایک شہ سے کہا
کروں میں عرض گر اس کو نہ سرسری جانے

امورِ ملکی میں اوّل ہے شہ کو یہ لازم	گدا نوازی و درویش پروری جانے
مقامِ عدل پہ جس دم سریر آرا ہو	ہر ایک خُورد و کلاں میں برابری جانے
وہی ہو رائے مبارک میں اس کے گوشہ نشیں	کہ جس میں عامۂ خلقت کی بہتری جانے
ملازموں سے نہ لادے یہ اس کو بر سرِ کار	کہ جس سے کارِ خلائق کی ابتری جانے
ہمیشہ جود و کرم میں سمجھ ہر ایک کی قدر	مساوی از امرا تا بہ لشکری جانے

کسی کی مرگ پہ سودا نہ کیجئے چشم تر ہرگز	بہت سا رد یئے ان کو جو اس جینے پہ مرتے ہیں

مخمس شہر آشوب

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں تو ڈانواں ڈول
پھرے ہے جا کہیں نوکر ہو لے کے گھوڑا مول
لگا وہ کہنے یہ اُس کے جواب میں دو بول
جو میں کہوں گا تو سمجھے گا تُو کہ ہے یہ ٹھٹھول
بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیریوں یا تول
سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند
سو آمد اُن کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند

کیا ہے ملک کو مُدّت سے سرکشوں نے پسند

جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند

رہے نہ اس کے تصرّف میں فوجداری کول[1]

امیر اب جو ہیں دانا اُنھوں کی ہے یہ چال

ہوئے ہیں خانہ نشیں دیکھ کر زمانے کا حال

بچھی ہے سوزنی خوجا کھڑا جھلے ہے رومال

حضور بیٹھے ہیں ایک دو ندیم اہل کمال

دھری ہے روبرو اک پیکداں واک تنبول

نہ صرف خاص میں آمد نہ خالصہ جاری

سپاہی تا متصدی سبھوں کو بے کاری

اب آگے دفترِ تن کی میں کیا کہوں خواری

سوال دستخطی کو پھاڑ کر کے پنساری

کسی کو آنولہ دے باندھ کر کسی کو کٹول

کرے ہے بھوک سے شاگرد پیشہ اب یہ معاش

کہیں پلاؤ تو باورچی وہاں پکا وے آش

[1] نام پرگنہ

کریں قناتوں میں دربان بیٹھے پردہ فاش
تلے سے کھینچ لے مسند کو آن کر فراش
اگر کہیں کہ مٹا اُٹھ کے چاندنی کا بھول
غرض مآل ہے اس گفتگو سے یہ میرا
کہ بے زری نے جب ایسا گھر آن کر گھیرا
تو کوئی قصد کرے نوکری کا بہتیرا
نہیں یہ فائدہ کچھ تا وہ چھوڑ کر ڈیرا
کرے نہ عزم سوے اصفہان و استنبول
سخن جو شہر کی ویرانی سے کروں آغاز
تو اس کو سُن کے کریں ہوش جغد کے پرواز
نہیں وہ گھر نہ ہو جس میں شغال کی آواز
کوئی جو شام کو مسجد میں جاوے بہر نماز
تو وہاں چراغ نہیں ہے بجز چراغِ غول
خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس
کہ جس کے دیکھے سے جاتی رہے تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اُداس
بجائے گُل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس

کہیں ستون پڑا ہے کہیں پڑے مرغول

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم

نہ جانے کن نے رکھا یاں قدم وہ کون تھا شوم

جہاں تھے سرو صنوبر وہاں اُگے ہے زقوم

مچی ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم

گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھی کلول

جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا

مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا

کہ یوں اُٹھا دیا گویا کہ نقش باطل تھا

عجب طرح کا یہ بحر جہاں میں ساحل تھا

کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

بس اب خموش ہو سودا کہ آگے تاب نہیں

وہ دل نہیں کہ اب اس غم سے جو کباب نہیں

کسی کی چشم نہ ہوگی کہ وہ پُر آب نہیں

سوائے اس کے تری بات کا جواب نہیں

کہ یہ زمانہ ہے اس طرح کا زیادہ نہ بول

میر تقی میر

پیدائش اکبر آباد ۱۱۲۵ھ　　　　وفات لکھنؤ ۱۲۲۵ھ

میر تقی نام میر تخلص۔ اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ باپ کے مرنے کے بعد دلّی گئے اور ۱۱۹۰ھ میں دلّی سے لکھنؤ آئے۔ کہتے ہیں کہ لکھنؤ پہونچکر ایک سرا میں قیام کیا معلوم ہوا کہ ایک جگہہ مشاعرہ ہے فوراً غزل لکھکر مشاعرہ میں شامل ہوئے جب میر صاحب محفل میں داخل ہوئے تو اکثر اہل مشاعرہ ان کی قدیمانہ وضع پر مسکرائے اور بعض نے وطن پوچھا۔ میر صاحب نے ان کے جواب میں ذیل کا قطعہ پڑھا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو　　　ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب　　　رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا　　　ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

جب نواب آصف الدولہ کو معلوم ہوا تو دو سو روپیہ مہینہ کر دیا لیکن میر صاحب کی نازک مزاجی اور بد دماغی ضرب المثل ہے دربار کی پابندیوں کا بوجھ بھلا ان سے کب اُٹھ سکتا تھا کچھ دن بعد کسی بات پر بگڑ کر دربار کا جانا چھوڑ دیا۔ فقر و فاقہ میں گذارہ کرتے رہے آخر ۱۲۲۵ھ میں انتقال کیا۔ شیخ ناسخ نے تاریخ کہی ع

واویلا مُرد شہ شاعراں

میر صاحب کی زبان نہایت شستہ روزمرہ نہایت صاف اور کلام نہایت

سلیس اور سُلجھا ہوا ہے۔ ساری عمر ان کی مصیبت اور غم میں گذری۔ حسرت مایوسی اور ناکامی کا دُکھڑا ایشیا کے سبھی شاعر روتے ہیں فرق یہ ہے کہ اور جگ بیتی کہتے ہیں اور میر آپ بیتی۔ یہی وجہ ہے کہ کلام ایسا پُر درد اور پُر تاثیر ہے کہ سُننے والوں کے دلوں پر نشتر کا کام کرتا ہے مرزا سودا میر تقی کے ہمعصر تھے نقادان سخن کی رائے ہے کہ جو مرتبہ مرزا کا قصیدوں میں ہے وہی مرتبہ میر کا غزل میں ہے۔ چنانچہ مولوی محمد حسین صاحب آزاد دونوں استادوں کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "دراصل حقیقت یہ ہے کہ غزل مثنوی وغیرہ اقسام شعر میں ہر کوچہ کی راہ جُدا جُدا ہے۔ جس طرح قصیدہ کے لئے شکوہ الفاظ اور بلندی مضامین چُستی ترکیب وغیرہ لوازمات ہیں اسی طرح غزل کے لئے عاشق معشوق کے خیالات عشقیہ ذکر وصل شکایت فراق درد انگیز اور المناک حالت گفتگو ایسی بے تکلف صاف صاف نرم نرم گویا وہی دونو بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اس کے ادائے مضامین کے لئے الفاظ بھی اور ہیں اور اسکی بحریں بھی خاص ہیں۔ میر صاحب کی طبیعت درد خیز اور دل حسرت انگیز تھا کہ غزل کی جان ہے۔ اس لئے ان کی غزلیں ہی ہیں اور خاص خاص بحور و قوافی میں ہیں مرزا کی طبیعت ہمہ رنگ اور ہمہ گیر۔ ذہن براق اور زبان مشاق رکھتے تھے۔ توسن فکر ان کا مُنہ زور گھوڑے کی طرح جس طرف جاتا تھا رک نہ سکتا تھا۔ کوئی بحر اور کوئی قافیہ ان کے ہاتھ

آئے۔ تغزّل کی خصوصیت نہیں رہتی تھی۔ جس برجستہ مضمون میں بندھ جائے باندھ دیتے تھے بیشک اُن کی غزلوں کے بھی اکثر شعر چُستی اور درستی میں قصیدہ کا رنگ دکھاتے ہیں۔ ایک دن لکھنؤ میں مِیر اور مِیرزا کے کلام پر دو شخصوں میں تکرار نے طول کھینچا۔ دونوں خواجہ باسط کے مرید تھے اُنھیں کے پاس گئے اور عرض کی آپ فرمائیں۔ اُنھوں نے کہا کہ دونوں صاحب کمال ہیں مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام آہ ہے اور مرزا کا کلام واہ ہے۔ مثال میں میر صاحب کا شعر پڑھا۔

سرہانے مِیر کے آہستہ بولو اَبھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

پھر مرزا صاحب کا شعر پڑھا۔

سوؔدا کی جو بالیں پہ گیا شور قیامت خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

غزلوں کا انتخاب

ہنگامہ گرم کُن جو دلِ ناصبور تھا		پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا
پہونچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں		معلوم اَب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا
آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم		یک شعلہ برق خرمنِ صد کوہ طور تھا
کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا	قطعہ	یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر میں بھی کبھی کسی کا سرِ پُر غرور تھا

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میرؔ سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند

یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی

چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یہاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے تو اتنا ہے

رات کو رو رو صبح کیا۔ یا دن کو جوں توں شام کیا

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو

قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا	دم کے جانے کا نہایت غم رہا
دل نہ پہونچا گوشۂ داماں تلک	قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا
جامۂ احرام زاہد پر نہ جا	تھا حرم میں ایک نامحرم رہا
صبح پیری شام ہونے آئی میرؔ	تو نہ چیتا یاں بہت دن کم رہا

منتظر کاہی کرے ہے جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

فیض اے ابر چشم تر سے اٹھا
آج دامن وسیع ہے اس کا

تاب کس کو جو حال میر سنے
حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

جا کے پوچھا جو میں یہ کارگہ مینا میں
دل کی صورت کا بھی اے شیشہ گراں ہے شیشہ

کہنے لاگے کہ کدھر پھرتا ہے بہکا اے مست
ہر طرح کا جو تو دیکھے ہے کہ یاں ہے شیشہ

ق

دل ہی سارے تھے یہ ایک وقت میں جو کر کے گداز
شکل شیشہ کی بنائی ہے کہاں ہے شیشہ

بات کیا آدمی کی بن آئی
آسماں سے زمیں پہ نپوائی

چرخ زن اسکے واسطے ہے مدام
ہو گیا دن تمام رات آئی

ماہ و خورشید ابر باد سبھی
اسکے خاطر ہوئے ہیں سودائی

کیسے کیسے کئے تردد جب
رنگ رنگ اسکو چیز پہونچائی

اس کو ترجیح سب کے اوپر دی
لطف حق نے کی یہ عزت افزائی

حیرت آتی ہے اس کی باتیں دیکھ
خودسری خودستائی خودرائی

شکر کے سجدوں میں یہ واجب تھا
یہ بھی کرتا سدا جبیں سائی

موسم ہے نکلے شاخوں سے پتے ہرے ہرے
پودے چمن میں پھولوں سے دیکھے بھرے بھرے
آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سوگیا ہے سرہانے دھرے دھرے

جھٹ پٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھیرا
صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھیرا

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا
سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں
تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا
غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز
میرؔ اس کو رائگاں کھوتا ہے کیا

خواجہ حیدر علی آتش

پیدائش دِلّی سنہ نامعلوم وفات لکھنؤ ۱۲۶۳ء

ان کے باپ خواجہ علی بخش دلّی کے رہنے والے تھے۔ خواجہ آتش نے دلّی چھوڑکر پہلے فیض آباد پھر لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔ بھولے بھالے سیدھے سادے آدمی تھے آزادانہ انداز اور رندانہ وضع رکھتے تھے۔ اسّی روپیہ ماہانہ بادشاہ لکھنؤ کے یہاں سے ملتا تھا۔ جاہ وحشمت ظاہری سے انکی طبیعت نفور تھی۔ اُنھوں نے کبھی امرا اور سلاطین کی مدح میں قصیدے نہیں کہے اور ہمیشہ شان وشکوہ دنیوی کو ہیچ سمجھا شیخ امام بخش ناسخ ان کے ہمعصر تھے اور کبھی کبھی دونوں اُستادوں میں معاصرانہ نوک جھوک بھی ہوجاتی تھی۔ زبان کے صیغہ میں لکھنؤ کو دلّی کی مطابعت سے آزاد کرنے کا سہرہ انھیں دونوں اُستادوں کے سر ہے۔

خواجہ آتش نے غزل کے میدان سے باہر قدم نہیں رکھا لیکن اسمیں جو کچھ کہا وہ ایسا کیا کہ اُردو غزل کو معراج پر پہونچا دیا اس معنی میں اگر انکو اُردو کا حافظ کہا جائے تو بیجا نہیں۔ آتش کی زبان اُردو کا پاک اور لطیف سرچشمہ ہے جس سے کشت زار سخن میں آبیاری ہوتی ہے ان کا کلام محاورہ

اُردو کا دستورالعمل ہے اور شرفاء لکھنؤ کی بول چال کا اعلیٰ نمونہ ہے ساتھ ہی اس کے کوئی یہ نہیں کہ سکتا کہ آتش کے یہاں باتیں ہی باتیں ہیں کیونکہ انکے یہاں شاعری کے دوسرے محاسن بدرجہ اتم موجود ہیں۔ تصوف اور روحانیت کی چاشنی نے خواجہ کے اشعار میں ایک خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔ کلام میں استعارہ اور تشبیہ کی پختگی کلام کی تاثیر ہی کو نہیں بڑھاتی بلکہ شاعر کی باریک بینی اور نازک خیالی کا پتہ دیتی ہے۔ جذبات انسانی کی تصویر کھینچنے میں اس اُستاد نے الفاظ سے جو صناعی کی ہے وہ ہند کی انشا پردازی کے لئے مائیناز ہے۔ چنانچہ خواجہ صاحب خود ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں — شاعری بھی کام ہے آتش مرصّع ساز کا

غزلوں کا انتخاب

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تری آشنائی کا — نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا

تعلق روح سے مجھ کو جسد کا ناگوارا ہے — زمانہ میں چلن ہے چار دن کی آشنائی کا

ہوئی منظور محتاجی نہ تجکو اپنے سائل کی — بنایا کاسۂ سر واژگوں کاسہ گدائی کا

نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں تجکو — کوئی آئینہ خانہ کارخانہ ہے خدائی کا

شکستِ خاطرِ احباب ہوتی ہے درست اس سے — توجہ میں تری اے یار اثر ہے مومیائی کا

حسنِ پری ایک جلوۂ مستانہ ہے اُس کا
ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُس کا

گُل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش
بُلبُل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اُس کا

گریاں ہے اگر شمع تو سر دُھنتا ہے شعلہ
معلوم ہوا سوختہ پروانہ ہے اُس کا

وہ شوخ نہاں گنج کے مانند ہے اسمیں
معمورۂ عالم جو ہے ویرانہ ہے اُس کا

جو چشم کہ حیراں ہوئی آئینہ ہے اُس کی
جو سینۂ صد چاک ہوا شانہ ہے اُس کا

دل قصرِ شہنشہی وہ شوخ اس میں شہنشاہ
عرصہ یہ دو عالم کا جلو خانہ ہے اُس کا

وہ یاد ہے اسکی کہ بُھلادے دو جہاں کو
حالت کو کہے سے غیر وہ یارانہ ہے اُس کا

یوسف نہیں جو ہاتھ لگے چند درم سے
قیمت جو دو عالم کی ہے بیعانہ ہی اُس کا

آوارگی نکہتِ گُل سے ہے اشارہ
جامے سے جو باہر ہے وہ دیوانہ ہی اُس کا

یہ حال ہوا اُس کے فقیروں سے ہویدا
آلودۂ دنیا جو ہے بیگانہ ہے اُس کا

شکرانۂ ساقیِ ازل کرتا ہے آتش
لبریز مئے شوق سے پیمانہ ہے اُس کا

برنگِ شمع جس نے دل جلایا تیری دوری میں
تو اُس نے منزلِ مقصود کو زیرِ قدم پایا

ہزاروں حسرتیں جائینگی میرے ساتھ دنیا سے
شرارہ و برق سے بھی عرصۂ ہستی کو کم پایا

سوائے رنج کچھ حاصل نہیں ہے اس خرابہ میں
غنیمت جان جو آرام تو نے کوئی دم پایا

نظر آیا تماشائے جہاں جب بند کیں آنکھیں
صفائے قلب سے پہلو میں ہم نے جامِ جم پایا

عاجز نواز دوسرا تجھ سا نہیں کوئی / رنجور کا انیس ہے ہمدم علیل کا

باغ و بہار آتش نمرود کو کیا / مشکل کے وقت حامی ہوا تو خلیل کا

موسیٰ کو تیرے حکم سے دریا نے راہ دی / فرعون کو تو نے غرق کیا رود نیل کا

طوفاں میں ناخدائی کشتی نوح کی / حقا جواب ہی نہیں تجھ سے کفیل کا

آتش یہی دُعا ہے خدائے کریم سے / محتاج اے کریم نہ کیجو بخیل کا

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا / کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف / قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا

اُڑتا ہے شوق راحت منزل سے اسپِ عُمر / مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہے جلوہ گر / دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال / ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

آتی ہے کس طرح سے مری قبض روح کو / دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا

ہوتا ہے زرد سُن کے جو نامرد مدعی / رستم کی داستان ہے اپنا فسانہ کیا

نوٹ۔ غزل مذکورالصدر ایک خاص موقع پر کہی گئی تھی جس کو صاحب آب حیات یوں بیان فرماتے ہیں ایک نواب صاحب کے یہاں مشاعرہ تھا وہ اُن کے (شیخ ناسخ کے) معتقد تھے اُنھوں نے ارادہ کیا کہ شیخ ناسخ جب غزل پڑھ چکیں تو اُنھیں سرِ مشاعرہ خلعت دیں

یار لوگوں نے خواجہ صاحب کے پاس مصرع طرح نہ بھیجا۔ انھیں اُس وقت مصرع پہونچا جب ایک دن مشاعرہ میں باقی تھا خواجہ صاحب بہت خفا ہوئے اور کہا کہ اب لکھنؤ رہنے کا مقام نہیں ہم نہ رہیں گے۔ شاگرد جمع ہوے اور کہا کہ آپ کچھ خیال نہ فرمائیں نیازمند حاضر ہیں دو دو شعر کہیں گے تو صدہا شعر ہو جائیں گے وہ بہت تند مزاج تھے ان سے بھی ویسی تقریریں کرتے رہے۔ شہر کے باہر چلے گئے۔ پھرتے پھرتے ایک مسجد میں جا بیٹھے وہاں سے غزل کہکر لائے اور مشاعرہ میں گئے تو ایک قرابین بھی بھر کر لیتے گئے۔ بیٹھے ایسے موقع پر کہ عین مقابل شیخ صاحب کے تھے۔ اوّل تو آپ کا انداز ہی بانکے سپاہیوں کا تھا اُس پر قرابین بھری سامنے رکھی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ خود بھی بھرے بیٹھے ہیں۔ بار بار قرابین اُٹھاتے تھے اور رکھ دیتے تھے۔ جب شمع سامنے آئی تو سنبھل کر ہو بیٹھے اور شیخ صاحب کی طرف اشارہ کر کے پڑھا۔

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

اس ساری غزل میں کہیں ان کے بے پالک ہونے پر کہیں ذخیرہ دولت پر کہیں انکے سامان امارت پر غرض کچھ نہ کچھ چوٹ ضرور ہے۔ شیخ صاحب بیچارے دم بخود بیٹھے رہے۔ نواب صاحب ڈرے کہ خدا جانے یہ ان پر قرابین خالی کریں یا میرے پیٹ میں آگ بھر دیں اسی وقت داروغہ کو اشارہ کیا کہ دوسرا خلعت خواجہ صاحب کے لئے تیار کرو۔ غرض دونوں صاحبوں کو برابر خلعت دے کر رخصت کیا۔

دکھایا آئینۂ فکر نے جب صفائے آبِ دُرِ سخن کا
دہن کو جوہر کھلا زباں کا زباں کو عقدہ کھلا دہن کا

برہنہ آیا تھا یاں عدم سے برہنہ یاں سے چلا عدم کو
نہ بوئے کافور میں نے سونگھی نہ داغ مجھ کو لگا کفن کا

خراب مٹی نہ ہو کسی کی کوئی نہ مردودِ دوستاں ہو
جُدا ہوا شاخ سے جو پتا غبار خاطر ہوا چمن کا

شرف بخشا گہر کو صرف کر کے تو نے زیور میں
یہ کیفیت اُسے ملتی ہے ہو جس کے مقدر میں

رہا کرتا ہے نظم شعر کا سودا مرے سر میں
جہاں چاہے بسر اوقات کرے چار دن بُلبُل

نہ جب تک ہم پیالہ ہو میں ہرگز مے نہیں پیتا
مآل کار کی صورت بھی آنکھوں کو نظر آتی

نکل کر کنج عزلت سے نہ کر ہنگامہ افروزی
نگیں کو نام نے تیرے بٹھایا خانۂ زر میں

مئے الفت نہ خم میں ہے نہ شیشہ میں نہ ساغر میں
عروس فکر ان روزوں لدی رہتی ہے زیور میں

چمن میں آشیانہ ہے قفس صیاد کے گھر میں
نہیں مہمان تو فاقہ ہی خلیل اللہ کے گھر میں

لگا دینا تھا اک آئینہ بھی قبر سکندر میں
شرر یا قوت کا ہم سنگ ہے جبتک ہے پتھر میں

نشۂ دولت سے منعم پیرہن میں مست ہے
مرد مفلس حالتِ رنج و محن میں مست ہے

دورِ گردوں ہے خداوندا کہ یہ دورِ شراب
دیکھتا ہوں جس کو میں اس انجمن میں مست ہے

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے	زمیں یاں کی چہارم آسماں ہے
خدا پنہاں ہے عالم آشکارا	نہاں ہے گنج ویرانہ عیاں ہے
دلِ روشن ہے روشنگر کی منزل	یہ آئینہ سکندر کا مکاں ہے
تکلف سے بری ہے حُسن ذاتی	قبائے گُل میں گُل بوٹا کہاں ہے
شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ	قناعت بھی بہارِ بے خزاں ہے
خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی	گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے
طلبِ دُنیا کو کرکے زن مریدی ہو نہیں سکتی	خیالِ آبروئے ہمتِ مردانہ آتا ہے
تماشا گاہِ ہستی میں عدم کا دھیان ہو کس کو	کسے اس انجمن میں یادِ خلوت خانہ آتا ہے
زیارت ہوگی کعبہ کی یہی تعبیر ہے اس کی	کئی شب سے ہمارے خواب میں بتخانہ آتا ہے
خدا کا گھر ہے بتخانہ ہمارا دل نہیں آتشؔ	مقامِ آشنا ہے یاں نہیں بیگانہ آتا ہے

ہوائے دورِ مئے خوشگوار راہ میں ہے	خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے
عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ہستی میں	نہ کوئی شہر نہ کوئی دیار راہ میں ہے
سمندِ عمر کو اللہ رے شوقِ آتشؔ	عنان گسستہ و بے اختیار راہ میں ہے

نہ بدرقہ ہے نہ کوئی رفیق اپنے ساتھ
فقط عنایتِ پروردگار راہ میں ہے

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

مقام تک بھی ہم اپنے پہونچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے دشمن ہزار راہ میں ہے

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش
گُلِ مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے

سر شمع ساں کٹائیے پر دم نہ ماریئے
منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہاریئے

مقسوم کا جو ہے سو وہ پہونچے گا آپ سے
پھیلائیے نہ ہاتھ نہ دامن پساریئے

طالب کو اپنے رکھتی ہے دُنیا ذلیل و خوار
زر کی طمع سے چھانتے ہیں خاک نیاریئے

تنہائی ہے غریبی ہے صحرا ہے خار ہے
کون آشنائے حال ہے کس کو پکاریئے

کام ہمت سے جوانمرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

ناگوارا کو جو کرتا ہے گوارا انسان
زہر پی کر مزۂ شیر و شکر لیتا ہے

منزلِ فقر و فنا جائے ادب ہے غافل
بادشہ تخت سے یاں اپنے اُتر لیتا ہے

عقل کر دیتی ہے انساں کی جہالت زائل
موت سے جان چھپانے کو سپر لیتا ہے

غیرتِ نالہ و فریاد نہ کھو اے آتش
آشنا کوئی نہیں کون خبر لیتا ہے

میرزا اسد اللہ خاں غالب

غزلوں کا انتخاب

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفیِ منصور نہیں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پہ نہیں آتی

جانتا ہوں ثواب طاعتِ زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سی ہمکو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی
کعبہ کس مُنہ سے جاؤ گے غالب — شرم تم کو مگر نہیں آتی

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید — ناامیدی اُس کی دیکھا چاہئے

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے — نالہ پابند نے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے — پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے
ہاں کھائیو مت فریب ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

کہتا ہے کون نالۂ بُلبل کو بے اثر — پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

قطعات

رہیے اب ایسی جگہہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے — کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار — اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل — زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی — مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغباں و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں — نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

قصائد کا انتخاب

صبحدم دروازۂ خاور کھلا — مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا

خسروِ انجم کے آیا صرف میں — شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود — صُبح کو رازِ مہ و اختر کھُلا

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ — دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھُلا

سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو — موتیوں کا ہر طرف زیور کھُلا

صُبح آیا جانبِ مشرق نظر — اک نگارِ آتشیں رُخ سر کھُلا

تھی نظر بندی کیا جب ردِ سحر — بادۂ گلرنگ کا ساغر کھُلا

لاکے ساقی نے صبوحی کے لئے — رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھُلا

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ — کعبۂ امن و اماں کا در کھُلا

تاجِ زریں مہرِ تاباں سے سوا — خسروِ آفاق کے مُنہ پر کھُلا

شاہِ روشن دل بہادر شہ کہ ہے — رازِ ہستی اُس پہ سرتا سر کھُلا

وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں — مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھُلا

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے — عقدۂ احکامِ پیغمبر کھُلا

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام — اُس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھُلا

روشناسوں کی جہاں فہرست ہے — واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھُلا

توسنِ شہ میں وہ خوبی ہے کہ جب — تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھُلا

نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب — تو کہے بُت خانۂ آذر کھُلا

مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے — منصبِ مہر و مہ و محور کھُلا

لاکھ عقدے دِل میں ہیں لیکن ہر ایک — میری حدِ وسع سے باہر کھُلا

تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید — کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا

باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار — مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال — پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا

خامے نے پائی طبیعت سے مدد — بادباں بھی اٹھتے ہی لنگر کھلا

مہر کانپا چرخ چکر کھا گیا — بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا

شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ — اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے — اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا

ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے — دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا

فکر اچھی پر ستائش نا تمام — عجزِ اعجازِ ستائش گر کھلا

جانتا ہوں ہے خطِ لوحِ ازل — تم پہ اے خاقانِ نام آور کھلا

تم کرو صاحب قرانی جب تلک — ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام — جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح — یہی انداز اور یہی اندام

بارے دو دن کہاں رہا غائب — بندہ عاجز ہے گردشِ ایام

اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا — آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص — حبذا اے نشاطِ عامِ عوام

عذر میں تین دن نہ آنے کے — لے کے آیا ہے عید کا پیغام

اُس کو بھولا نہ چاہیے کہنا — صبح جو جائے اور آئے شام

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا — تیرا آغاز اور ترا انجام

رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے — مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام

جانتا ہوں کہ آج دُنیا میں — ایک ہی ہے امیدگاہِ انام

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش — غالب اُس کا مگر نہیں ہے غلام

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو — تب کہا ہے بطرزِ استفہام

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ — قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام

تجکو کیا پایہ روشناسی کا — جز بتقریبِ عیدِ ماہِ صیام

جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تو — پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون — مجکو کیا بانٹ دے گا تو انعام

میرا اپنا جُدا معاملہ ہے — اور کے لین دین سے کیا کام

ہے مُجھے آرزوئے بخششِ خاص — گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجکو فرِّ فروغ — کیا نہ دے گا مُجھے مئے گلفام

جب کہ چودہ منازلِ فلکی — کر چکی قطع تیری تیزیٔ گام

تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر — کوے و مشکوے صحن منظر عام

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز — اپنی صورت کا اک بلوریں جام

مطلع ثانی

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ ‌ ‌ ‌ ‌ اے پری چہرہ پیک تیز خرام

کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا ‌ ‌ ‌ ‌ ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن ‌ ‌ ‌ ‌ نام شاہنشہ بلند مقام

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ ‌ ‌ ‌ ‌ مظہرِ ذو الجلال والاکرام

شہسوارِ طریقۂ انصاف ‌ ‌ ‌ ‌ نو بہارِ حدیقۂ اسلام

جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز ‌ ‌ ‌ ‌ جس کا ہر قول معنیِ الہام

بزم میں میزبانِ قیصر و جم ‌ ‌ ‌ ‌ رزم میں اوستادِ رستم و سام

اے ترا لطف زندگی افزا ‌ ‌ ‌ ‌ اے ترا عہد فرخی فرجام

جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم ‌ ‌ ‌ ‌ جرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام

وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے ‌ ‌ ‌ ‌ ایرج و تور و خسرو و بہرام

زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے ‌ ‌ ‌ ‌ گیو و گودرز و بیژن و رہّام

مرحبا موشگافیِ ناوک ‌ ‌ ‌ ‌ آفریں آبداریِ صمصام

تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف ‌ ‌ ‌ ‌ تیغ کو تیرے تیغِ خصم نیام

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند ‌ ‌ ‌ ‌ برق کو دے رہا ہے کیا الزام

تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا ‌ ‌ ‌ ‌ تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

آم کی تعریف

ہاں دلِ دردمند زمزمہ ساز — کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز

خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا — شاخِ گُل کا ہے گلفشاں ہونا

مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھئے — نکتہ ہائے خرد فزا لکھئے

بارے آموں کا کچھ بیاں ہوجائے — خامہ نخل رطب فشاں ہوجائے

آم کا کون مرد میداں ہے — ثمر و شاخ گوے و چوگاں ہے

تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں — آے یہ گوے اور یہ میداں

آم کے آگے پیش جاوے خاک — پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

نہ چلا جب کسی طرح مقدور — بادۂ ناب بن گیا انگور

یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے — شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے — آم کے آگے نیشکر کیا ہے

نہ گُل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار — جب خزاں آئے تب ہو اسکی بہار

اور دوڑائیے قیاس کہاں — جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر — کہ دواخانۂ ازل میں مگر

آتش گُل پہ قند کا ہے قوام — شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام

یا یہ ہوگا کہ فرط رافت سے — باغبانوں نے باغ جنّت سے

انگبیں کے بہ حکم رب الناس
بھر کے بھیجے ہیں سر بہ مہر گلاس

یا خضر نے لگا کے شاخ نبات
مدّتوں تک دیا ہے آب حیات

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل
ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل

رونق کارگاہ برگ و نوا
نازشِ دودمان آب و ہوا

رہروِ راہ خلد کا توشہ
طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم
ناز پروردۂ بہار ہے آم

غالب اور ذوق کے سہرے

مولوی محمد حسین صاحب آزاد اپنی بے نظیر تصنیف آبِ حیات میں ذیل کے نظموں کی شان نزول یوں ارقام فرماتے ہیں۔

"نواب زینت محل کو بادشاہ (بہادر شاہ بادشاہ دہلی) کے مزاج میں بہت دخل تھا مرزا جواں بخت اُن کے بیٹے تھے + . جب ان کی شادی کا موقع آیا تو بڑی دھوم دھام کے سامان ہوئے مرزا نے سہرا کہہ کر حضور میں گذرانا۔ مقطع کو سُن کر حضور کو خیال ہوا کہ اس میں ہم پر چشمک ہے۔ گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس سہرے کے برابر کوئی سہرا کہنے والا نہیں ہم نے جو شیخ ابراہیم ذوق کو اُستاد اور ملک الشعرا بنایا ہے یہ سخن فہمی ہے

بعید ہے بلکہ طرفداری ہے چنانچہ اسی دن اُستاد مرحوم (شیخ ابراہیم ذوقؔ) جو حسب معمول حضور میں گئے تو بادشاہ نے وہ سہرا دیا کہ استاد اِسے دیکھئے اُنھوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی۔ پیرو مرشد درست۔ بادشاہ نے کہا کہ اُستاد تم بھی ایک سہرا کہدو عرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا کہ ابھی لکھ دو اور ذرا مقطع پہ بھی نظر رکھنا۔ اُستاد مرحوم وہیں بیٹھ گئے اور عرض کیا (ذوق کا سہرا بھی ذیل میں درج ہے)

ارباب نشاط حضور میں ملازم تھیں اُسی وقت اُنھیں ملا۔ شام تک شہر کی گلی گلی کوچہ کوچہ میں پھیل گیا دوسرے ہی دن اخباروں میں مشتہر ہوگیا مرزا بھی بڑے ادا شناس اور سخن فہم تھے۔ سمجھے کہ تھا کچھ اور ہوگیا کچھ اور۔ یہ قطعہ حضور میں گذرانا۔"

میرزا غالب

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا	باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پہ سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے	ہے ترے حُسن دل افروز کا زیور سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ	مُجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا نمبر سہرا
ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی	ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی	تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینا ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رُخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تارِ ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گرانباریٔ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھ کر سہرا

شیخ محمد ابراہیم۔ ذوق

اے جواں بخت مبارک ترے سر پر سہرا
آج ہے یمن سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک
کشتیٔ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

تابشِ حُسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رُخِ پُر نور پہ ہے تیرے منور سہرا

وہ کہے صلِّ علیٰ یہ کہے سبحان اللہ
دیکھیں مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تا بنے دھور بنی میں رہے اخلاص بہم
گوندھئے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مُرغانِ نوا سنج نہ کیونکر سہرا

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار ‎ ‎ ‎ تار بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئین ہے دمِ آرائش ‎ ‎ ‎ سر پہ دستار رہے، دستار کے اوپر سہرا

اک گہر بھی نہیں صدکان گہر میں چھوڑا ‎ ‎ ‎ تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی بادِ بہار ‎ ‎ ‎ اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

سر پہ طرّہ ہے مزین تو گلے میں بدّھی ‎ ‎ ‎ کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک ‎ ‎ ‎ کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا

کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے ‎ ‎ ‎ دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا

دُرِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا ‎ ‎ ‎ واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سنا دے اُسکو
دیکھ اسطرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

معذرت از میرزا غالب

منظور ہے گذارش احوال واقعی ‎ ‎ ‎ اپنا بیان حُسن طبیعت نہیں مجھے

سو پُشت سے ہے پیشہ آبا سپہگری ‎ ‎ ‎ کُچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صُلح کل ‎ ‎ ‎ ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں ‎ ‎ ‎ مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

اُستاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال ‎ ‎ ‎ یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ۔ ہاں اس سے مدعا
جز انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے

سہرہ لکھا گیا زرہِ امتثال امر
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

میر ببر علی انیس

پیدائش فیض آباد ۱۲۱۶ھ — وفات لکھنؤ ۱۲۹۱ھ

میر ببر علی انیسؔ کا خاندان دلی کا خاندان تھا۔ اُن کے پردادا میر ضاحک نے دلی چھوڑ کر فیض آباد میں سکونت اختیار کی۔ میر حسن صاحب مثنوی بدر منیر اُن کے بیٹے تھے جب نواب آصف الدولہ نے فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ کو دارالریاست قرار دیا تو تعلقات شاہی کی وجہ سے میر ضاحک اور میر حسن کی آمد و رفت لکھنؤ میں جاری ہوئی اور آخر کار میر حسن کے صاحب زادہ میر خلیق نے شاید زمانۂ امجد علی شاہ میں فیض آباد ترک کر کے لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کی۔

میر خلیق اپنے زمانہ کے نامی مرثیہ گو تھے اور اُنھوں نے اور اُن کے ہمعصر

میر ضمیر نے اپنے زمانہ میں مرثیہ کے فن کو بہت ترقی دی۔ اس سے ظاہر ہے
کہ میر انیس خاندانی شاعر اور ذاکر تھے چنانچہ ایک موقع پر خود فرماتے ہیں ؎

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیّاحی میں   پانچویں پشت ہے شبّیر کی مدّاحی میں

جب میر خلیق بوڑھے ہوئے تو میر انیس نے باپ کی جگہ لی دوسرے طرف سے
میر ضمیر کے شاگرد رشید مرزا دبیر اُن کے مقابلے کو نکلے۔ اس زمانہ کا لکھنؤ اس
فن کی ترقی کے لئے خاص طور سے موزوں تھا اول تو سلطنت اودھ کا
شباب تھا دوسرے بڑی بات یہ تھی کہ بادشاہ سے لے کر امراء اور غربا تک
شیعہ مذہب رکھتے تھے، تیسرے میر ضمیر اور میر خلیق کی طبع آزمائیوں نے اس
صنف سخن کو پہلے کے مقابلہ میں بہت بلند اور وسیع کر دیا تھا۔ لوگوں نے ان
دونوں بزرگوں کو نقطۂ مقابل کر کے تعریفیں شروع کر دیں اور ان سخن
آفرینوں کی جدت پسند طبیعتوں نے ایک دوسرے کی چوٹ پر طبع آزمائیاں
کر کے اختراع اور ایجاد کے دریا بہا دیئے۔ جب تک لکھنؤ آباد رہا دونوں صاحب
کبھی باہر نہیں گئے تھے لیکن لکھنؤ کی تباہی کے بعد عظیم آباد۔ حیدر آباد۔ بنارس
الہ آباد وغیرہ کو ان مقتدر مہمانوں کی میزبانی کا فخر کبھی کبھی حاصل ہوا کرتا تھا۔
ہر جگہ کے سخن شناس دونوں اُستادوں کو آنکھوں پر بٹھاتے تھے اور جیسی
کچھ کہ چاہیئے قدر دانی کرتے تھے میر صاحب کے مرنے پر مرزا دبیر نے تاریخ کہی۔

طور سینا بے کلیم اللہ ممبر بے انیس

میرانیس کے کلام کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ مولوی محمد حسین صاحب آزاد صاحب تذکرہ آب حیات میں فرماتے ہیں "انھوں نے ایجاد مضامین کے دریا بہا دئے۔ ایک مقطرہ مضمون کو سیکڑوں نہیں ہزاروں رنگ سے ادا کیا۔ ہر مرثیہ کا چہرہ نیا۔ آمد نئی۔ رزم جدا، بزم جدا۔ اور ہر میدان میں مضمون اچھوتا۔ تلوار نئی۔ نیزہ نیا۔ گھوڑا نیا۔ انداز نیا۔ مقابلہ نیا۔ اور اس پر کیا منحصر ہے صبح کا عالم دیکھو تو سبحان اللہ۔ رات کی رخصت سیاہی کا پھٹنا۔ نور کا ظہور۔ آفتاب کا طلوع، مرغزار کی بہار شام ہے تو شام غریباں کی اداسی کبھی رات کا سناٹا کبھی تاروں کی چھاؤں کو چاندنی اور اندھیرے کے ساتھ رنگ کر رنگ دکھایا ہے۔ غرض جس حالت کو لیا ہے اس کا سماں باندھ دیا ہے جس طرح ان کا کلام لاجواب دیکھتے ہو اسی طرح ان کا پڑھنا بھی بے مثال ہی تھا۔ ان کی آواز۔ ان کی قد و قامت۔ ان کی صورت کا انداز غرض ہر شے اس کام کے لئے ٹھیک اور موزوں واقع ہوئی تھی۔ اُن کا اور اُن کے بھائیوں کا یہی قاعدہ تھا کہ ایک بڑا آئینہ سامنے رکھ کر خلوت میں بیٹھتے تھے اور مرثیہ پڑھنے کی مشق کرتے تھے۔ وضع۔ حرکات۔ سکنات اور بات بات کو دیکھتے تھے اور آپ کی اور اسکی موزونی پر خیال کرتے تھے"۔

اصل یہ ہے کہ انیس اُردو میں ایک ایسا شاعر ہے جس نے غزل کے تنگ میدان سے نکل کر اردو شاعری کو وسعت دی۔ مناظر قدرت اور

جذبات انسانی کی تصویریں جو انیس نے کھینچی ہیں اُن کا جواب اُردو زبان میں ملنا دشوار ہے۔ انیس کی شاعری میں مصوّری کا لُطف آتا ہے۔ اس خیال سے انیس اور ٹینی سن کی شاعری میں بہت مشابہت ہے۔ انیس کی زبان میں بھی ایک خاص لطافت ہے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نور کا دریا بہ رہا ہے۔ انیس کے کلام میں شاید ایک بھی دقیق اور غیر فصیح لفظ نہ ملے گا۔ بندش کی چستی۔ نشست الفاظ کی خوبی۔ ترکیب کی دلاویزی۔ برجستگی اور سلاست میر صاحب کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ اگر اُردو شاعری کو موجودہ زمانہ میں وسعت دینے کی کوشش کیجائے تو انیس کی شاعری کی تقلید سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔

مناجات

یارب چمنِ نظم کو گلزار ارم کر تو فیض کا مبدا ہے، توجہ کوئی دم کر		اے ابر کرم خشک زراعت پہ کرم کر گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
	جب تک یہ چمک مہر کی پرتو سے نہ جائے اقلیم سخن میرے قلمرو سے نہ جائے	
اس باغ میں چشمے ہیں ترے فیض کے جاری ہر نخل برومند ہے یا حضرتِ باری		بُلبُل کی زباں پر ہے تری شکر گزاری پھل ہم کو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری
	وہ گل ہوں عنایت چمنِ طبع نکو کو	

ہوا ایک زباں ماہ سے تا مسکنِ ماہی
جرأت کا دھنی تو ہے یہ چلائیں سپاہی
عالم کو دکھا دے برشِ سیفِ الٰہی
لاریب ترے نام پہ ہے سکۂ شاہی

ہر دم یہ اشارہ ہو دوات اور قلم کا
تو مالک و مختار رہے اس طبل و علم کا

صبح کی بہار

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اختران صبح
ہونے لگا اُفق سے ہویدا نشان صبح
ہر سو ہوئی بلند صدائے اذان صبح

پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلع انوار ہو گیا

خورشید نے جو رخ سے اُٹھایا نقابِ شب
انجم سے فرد فرد سے لے کر حسابِ شب
در کھل گیا سحر کا ہوا بند بابِ شب
دفتر کشائے صبح نے اُلٹی نقابِ شب

گردوں پہ رنگ چہرۂ مہتاب فق ہوا
سلطانِ غرب و شرق کا نظم و نسق ہوا

پہونچا جو مہر سے فرمان عزلِ شب
منشی آسماں مع دفتر ہوا طلب
گردوں پہ عاملانِ سحر کا ہوا نصب
بس جابجا سے اُٹھ گئی انجم کی فوج سب

تا صبح فرد فرد میں بیگانگی ہوئی
برخاست کی چراغوں کو پروانگی ہوئی

یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے رواں
آئی بہار پر گلِ مہتاب کی خزاں
چُن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
مُرجھا کے گر گئے ثمرِ شاخِ کہکشاں

دکھلائے طور بادِ سحر نے سموم کے
پژمُردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور
وہ رونق اور سرد ہوا وہ فضا وہ نور
یادِ خدا میں زمزمہ پردازئے طیور
خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سرور

انساں زمیں پہ محو ملک آسمان پر
جاری تھا ذکرِ قدرتِ حق ہر زبان پر

وہ سرخیِ شفق کی اُدھر چرخ پر بہار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہر ہائے آبدار
وہ بار ور درخت وہ صحرا وہ سبزہ زار
پھولوں سے سب بھرا ہوا دامانِ کوہسار

نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کے شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح
کرنے لگا فلک زرِ انجم نثارِ صبح
گلزارِ شب خزاں ہوا آئی بہارِ صبح
سرگرمِ ذکرِ حق ہوئے طاعت گزارِ صبح

تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا

کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

چلنا نسیم صبح کے جھونکوں کا دمبدم
وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم

مرغان باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

وہ پھولنا شفق کا وہ مینائے لاجورد
رکھتی تھی پھونک کر قدم اپنا ہوائے سرد

مخمل سی وہ گیاہ وہ گل سبز و سرخ و زرد
یہ خوف تھا کہ دامنِ گل پر پڑے نہ گرد

دھوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا
سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

گرمی کی شدت

وہ لُو وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے قلب

کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خیمے تھے جو حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب

سرخی اڑی تھی پھولوں سے سبزی گیاہ سے
سایہ کنوئیں میں اترا تھا پانی کی چاہ سے

آبِ رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر

جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر
خسخانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر

گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں

پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب و تپ کی تاب — چھپنے کو برق چاہتی تھی دامنِ سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب — کافورِ صبح ڈھونڈھتا پھرتا تھا آفتاب
بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اثیر میں
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

شیر اُٹھتے تھے نہ خوف کے مارے کچھار سے — آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے — گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوّالہ کا گماں — انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں — تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

گھوڑے کی تعریف

وہ جست و خیز و سرعت و چالاکیِ سمند — سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اُس کے جوڑ بند
سُم قرصِ ماہتاب سے روشن ہزار چند — نازک مزاج و شوخ و سیہ چشم و سربلند

پُتلی جدھر سوار نے پھیری وہ مُڑ گیا
اُترا وہ برق بن کے پری ہو کے اُڑ گیا

جرأت میں رشکِ شیر تو ہیکل میں پیلتن
بجلی کسی جگہ تو کہیں ابر قطرہ زن
پوئی کے وقت کبک دری جست میں ہرن
بن بن کے آنے جانے میں طاؤس کا چلن
سیماب تھا زمیں پہ فلک پر سحاب تھا
دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا

غصے میں انکھڑیوں کے اُبلنے کو دیکھئے
سانچے میں جوڑ بند کے ڈھلنے کو دیکھئے
بن بن کے جھوم جھوم کے چلنے کو دیکھئے
تھم تھم کر کنوتیوں کے بدلنے کو دیکھئے
وہ تھوتھنی کہ غنچۂ سوسن سے تنگ تر
وہ انکھڑیاں خجل ہوں ہرن جنکو دیکھکر

شمشیر آبدار

بے پاؤں جدھر ہاتھ سی چلتی ہوئی آئی
دم بھر میں وہ سو رنگ بدلتی ہوئی آئی
ندی اُدھر اک خوں کی اُبلتی ہوئی آئی
پی پی کے لہو لعل اُگلتی ہوئی آئی
ہیرا تھا بدن رنگ زمرد سے ہرا تھا
جوہر جو کہو پیٹ جواہر سے بھرا تھا

زیبا تھا دمِ جنگ پہ پوشش اُسے گہنا
معشوق بنی سُرخ لباس اُس نے جو پہنا

اس اوج پہ وہ سر کو جھکائے ہوئے رہنا
جوہر تھے کہ پہنے تھی دولہن پھولوں کا گہنا
سیب چمن خلد کی بو باس تھی پھل میں
رہتی تھی وہ شبیر سے دولھا کے بغل میں

پہونچی جو سپر تک تو کلائی کو نہ چھوڑا
ہر ہاتھ میں ثابت کسی گھائی کو نہ چھوڑا
شوخی کو شرارت کو لڑائی کو نہ چھوڑا
تیزی کو رکھائی کو صفائی کو نہ چھوڑا
اعضائے بدن قطع ہوئے جاتے تھے سب کے
قینچی سی زباں چلتی تھی فقرے تھے غضب کے

تلوار کا کاٹ

بجلی گری کہ فوج پہ تیغ دو سر گری
کٹ کر کسی کی تیغ، کسی کی سپر گری
چمکی کبھی فلک پہ کبھی فرق پر گری
سر کاٹ کر، ادھر سے جو اٹھی ادھر گری
زرہیں تنوں میں مثل کفن چاک ہوگئیں
اک آن میں صفیں کی صفیں خاک ہوگئیں

غل تھا کہ وہ چمکتی ہوئی آئی، یہ گری
برچھی سے اڑ گئی وہ سناں، یہ گرہ گری
ترکش کٹا کمان کیانی سے زہ گری
یہ سر اڑا، وہ خود اڑا، یہ زرہ گری
آتی ہے لشکروں پہ تباہی اسی طرح
گرتی ہے برق قہر الٰہی اسی طرح

کیا کیا چمک دکھاتی تھی سرکاٹ کاٹ کے
تنتی تھی بس تنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے
پانی وہ خود پئے ہوئے تھی گھاٹ گھاٹ کے
دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے

کیا جانئے ملا تھا مزا کیا زبان کو
کھا جاتی تھی ہما کی طرح استخوان کو

ہر بات میں اُڑا کے کلائی نکل گئی
کوندی، گری، زمیں میں سمائی نکل گئی
کاٹ زرہ دکھا کے صفائی نکل گئی
مچھلی تھی اک کہ دام میں آئی نکل گئی

چار آئینہ کے پار تھی اس آب و تاب سے
جس طرح برق گر کے نکل جائے آب سے

مسافرت

ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں
راحت نہیں ملتی کوئی دم آٹھ پہر میں
سو شغل ہوں پر دھیان لگا رہتا ہے گھر میں
پھرتی ہے سدا شکل عزیزوں کی نظر میں

سنگِ غمِ فرقت دلِ نازک پہ گراں ہے
اندوہ غریب الوطنی کاہش جاں ہے

گو راہ میں ہمراہ بھی ہو راحلہ و زاد
جاتی نہیں افسردگی خاطرِ ناشاد
جب عالمِ تنہائی میں آتا ہے وطن یاد
ہر گام پہ دل مثل جرس کرتا ہے فریاد

اک آن غم و رنج سے فرصت نہیں ہوتی

منزل پہ بھی آرام کی صورت نہیں ہوتی

ہمراہ سفر میں ہوں اگر حامی و ناصر　　منزل پہ کمر کھول کے سوتے ہیں مسافر
جب ہو سفر خوف و پریشانئ خاطر　　شب جاگتے ہی جاگتے ہو جاتی ہے آخر

ہر طرح مسافر کے لئے رنج و تعب ہے
رہ جائے پس قافلہ تھک کر تو غضب ہے

دُکھ دیتے ہیں ایک ایک قدم پاؤں کے چھالے　　منزل پہ پہونچنے کے بھی پڑ جاتے ہیں لالے
ہاتھوں سے اگر بیٹھ کے کانٹوں کو نکالے　　ڈر ہے کہ نہ بڑھ جائیں کہیں قافلے والے

واماندوں کے لینے کو بھی آتا نہیں کوئی
تھک کر بھی جو بیٹھے تو اُٹھاتا نہیں کوئی

عجز و انکسار

خاموش زباں دعوئ بیجا نہیں اچھا　　ہو جس میں تکبر سخن ایسا نہیں اچھا
بس بس یہ غرور اور یہ دعوے نہیں اچھا　　آپ اپنی ثنا واہ یہ شیوہ نہیں اچھا

کم مایہ کمال اپنا جتا دیتا ہے اکثر
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے اکثر

خورشید کو کچھ حاجت زیور نہیں زنہار　　پھولوں پہ کوئی عطر لگائے تو ہی بیکار

اعلیٰ ہے اگر جنس تو کیا حاجتِ اظہار
خود مشک ہو خوشبو نہ کہ خوشبو کہے عطار

جو بد ہے سو بد ہے جو نکو ہے سو نکو ہے
چھپنے کی نہیں آپ اگر عود میں بو ہے

انساں کے لئے عجز ہی لازم ہے بہر کیف
ہے خانۂ دُنیا میں ہر اک پیر و جواں ضعیف
گر صاحب جوہر نہ چلے جھک کے تو صد حیف
خارج ہے اصالت سے وہ کستی نہیں جو سیف

آفاق میں یوں فیضِ نگیں عام نہ ہوتا
ہوتا نہ فروتن تو کبھی نام نہ ہوتا

اولاد

دولت کوئی دُنیا میں پسر سے نہیں بہتر
راحت کوئی آرام جگر سے نہیں بہتر
لذت کوئی پاکیزہ ثمر سے نہیں بہتر
نکہت کوئی بُوئے گل تر سے نہیں بہتر

صدموں میں علاجِ دلِ مجروح یہی ہے
ریحاں ہے یہی رُوح یہی روح یہی ہے

ماں باپ کا دل غنچۂ خنداں ہے اسی سے
وہ گُل ہے کہ گھر رشکِ گلستاں ہے اسی سے
سب راحت و آرام کا ساماں ہے اسی سے
آبادی کاشانۂ انساں ہے اسی سے

کس طرح کھُلے دل کہ جگر بند نہیں ہے
گھر قبر سے بدتر ہے جو فرزند نہیں ہے

یہ وہ ہے عصا پیر جواں رہتا ہے جس سے
وہ شمع ہے پُر نور مکاں رہتا ہے جس سے

یہ وہ ہے نگیں نام و نشاں رہتا ہے جس سے
وہ دُر ہے قوی رشتۂ جاں رہتا ہے جس سے

کھوتے نہیں یہ مال زر و مال کے بدلے
موتی بھی لٹا دیتے ہیں اس لال کے بدلے

صولت یہی شوکت یہی اجلال یہی ہے
سرمایہ یہی نقد یہی مال یہی ہے

ثروت یہی حشمت یہی اقبال یہی ہے
گوہر یہی یاقوت یہی لعل یہی ہے

دلبند ہو پہلو میں تو غم پاس نہیں ہے
کچھ پاس نہیں گر یہ رقم پاس نہیں ہے

ماں باپ کی آسایش و راحت ہے پسر سے
خواں جسم میں آنکھوں میں بصارت ہے پسر سے

تلخی میں بھی جینے کی حلاوت ہے پسر سے
ایام ضعیفی میں بھی طاقت ہے پسر سے

آرام جگر قوتِ دل راحتِ جاں ہے
پیری میں یہ طاقت ہے کہ فرزند جواں ہے

وہ شے ہے خوشی در پہ کھڑی رہتی ہے جس سے
وہ لعل ہے امید بڑی رہتی ہے جس سے

وہ چین ہے راحت کی گھڑی رہتی ہے جس سے
وہ دُر ہے یہ دُر جان لڑی رہتی ہے جس سے

آرام جگر تاب و تواں ساتھ ہے اُس کے
پھرتا ہے جدھر رشتۂ جاں ساتھ ہے اُس کے

مالک سے بھرے گھر کے اُجڑ جانے کو پوچھو

گھر والوں سے اس تفرقہ پڑ جانے کو پوچھو

ماں باپ سے قسمت کے بگڑ جانے کو پوچھو | یعقوب سے یوسف کے بچھڑ جانے کو پوچھو

اللہ دکھائے نہ الم نورِ نظر کا
بہ جاتا ہے آنکھوں سے لہو قلب جگر کا

رُباعیات

آغوشِ لحد میں جبکہ سونا ہوگا | جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہووے گا انیس | ہم ہوویں گے اور قبر کا کونا ہوگا

دُنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی | سب چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا | جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہوگا | ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہوا ہوا کرم سے تیرے | جو کچھ ہوگا ترے کرم سے ہوگا

جو شے ہے فنا اُسے بقا سمجھا ہے | جو چیز ہے کم اُسے سوا سمجھا ہے
ہے بحرِ جہاں میں عمر مانندِ حباب | غافل اس زندگی کو کیا سمجھا ہے
اب گرم خبر موت کے آنے کی ہے | نادان تجھے فکر آب و دانے کی ہے

ہستی کے لئے ضرور اک دن ہے فنا
آنا تیری دلیل جانے کی ہے

دیتا ہے
رتبہ جسے دُنیا میں خدا دیتا ہے
وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں
یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

ماں باپ سے بھی سوا ہے شفقت تیری
افزوں ہے ترے غضب سے رحمت تیری
جنت انعام کر کہ دوزخ سے جلا
وہ رحم ترا ہے یہ عدالت تیری

ممکن نہیں عہدے سے عبادت تیری
خلق و کرم و عطا ہے عادت تیری
صحرا صحرا ہیں گو کہ عصیاں میرے
دریا دریا مگر ہے رحمت تیری

کیا کیا دُنیا سے صاحب مال گئے
دولت نہ گئی ساتھ نہ اطفال گئے
پہونچا کے لحد تلک پھر آئے سب لوگ
ہمراہ اگر گئے تو اعمال گئے

پُتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو
آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور ہے تو
نزدیک رگِ جاں سے ہے اس پر یہ بُعد
اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو

عزت رہے یار و آشنا کے آگے
محجوب نہ ہوں شاہ و گدا کے آگے
یہ پانوں چلیں تو راہ مولا میں انیسؔ
یہ ہاتھ جب اُٹھیں تو خدا کے آگے

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی

پیدائش پانی پت ۱۸۳۷ء

خواجہ الطاف حسین صاحب حالی کا سلسلہ خاندانی حضرت عبداللہ انصاری سے ملتا ہے آپ کے والد کا نام ایزد بخش تھا مولد پانی پت ہے مگر نوجوانی ہی میں دلّی آ گئے۔ نواب مصطفےٰ خاں صاحب رئیس جہانگیر آباد اس زمانہ میں بڑے عالم اور قدر دان رئیس تھے جاگیر اگرچہ جہان آباد میں تھی مگر رہتے دلّی میں تھے مولانا حالی ان کے لڑکوں کی معلمی پر مامور ہوئے اُردو فارسی میں میرزا غالب کی شاگردی سے فیض حاصل کیا جب قدیم سرپرست راہی عالم بقا ہوئے اور میرزا غالب سے بھی دنیا خالی ہوئی تو خواجہ صاحب اوّل دلّی کے اینگلو عربی اسکول میں فارسی کی مدرسی پر مامور ہوئے اور اس کے بعد رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب کی سفارش سے لاہور کے تعلیمی بُک ڈپو میں کام کرنے لگے۔ وہاں ان کا مولوی محمد حسین آزاد کا ساتھ ہوا اور آزاد کی تقلید میں مولانا ممدوح نے نیچرل شاعری کی طرف توجہ کی جب بُک ڈپو ٹوٹا تو حالی پھر دلّی میں اپنی پہلی جگہ پر آئے اور یہیں اُنھوں نے مسدس مدوجزر اسلام لکھا اس مسدس کی بہت قدر ہوئی۔ اس کے بعد حیدرآباد سے ان کا وظیفہ مقرر ہو گیا جو اب تک ملتا ہے۔ ۱۹۰۴ء میں سرکار انگریزی کی طرف سے شمس العلما کا

خطاب ملا۔ اس وقت مولانا حالی پانی پت میں خانہ نشین ہیں یادگار غالب
حیات سعدی اور حیات جاوید مولانا کی مشہور کتابیں ہیں اور اُردو کے نثر کے ذخیرے
میں یہ تصانیف یادگار رہیں۔

مولانا حالی کے کلام نظم کے متعلق ارباب نظر میں اختلاف ہے جو حضرات
محض پاکیزگی خیالات کو شاعری کا جوہر کہتے ہیں بلا لحاظ اس امر کے کہ ان خیالات
کو کس پیرایہ میں ادا کیا گیا ہے وہ مولانا موصوف کو نئی شاعری کا پیمبر سمجھتے ہیں
اور امر واقعی یہی ہے کہ جس قدر نئے خیالات آپ نے نظم کئے ہیں کسی دوسرے
شخص نے نظم نہ کئے ہوں گے لیکن جن نقادان سخن کی یہ رائے ہے کہ شاعری
کا پہلا اصول یہ ہے کہ نثر سے زیادہ پُر تاثیر و دلکش ہو اور محض خیالات
کی پاکیزگی ارکان شاعری میں نہیں ہے بلکہ خیالات کے پر تاثیر اور لطیف
پیرایہ میں نظم ہونے کو شاعری کہتے ہیں وہ مولانا ممدوح کے کلام کی
داد دینے میں تامل کرتے ہیں۔ وہ مولانا حالی کے محب قوم اور عالی خیال
بزرگ ہونے کے ضرور معتر ہیں مگر شاعرانہ حیثیت سے مولانا موصوف کے
کلام کے قائل نہیں۔

مرثیہ جناب مرزا اسد اللہ خاں مرحوم دہلوی متخلص بہ غالب

وقت کوتاہ قصہ طولانی	کیا کہوں حال درد پنہانی

عیش دنیا سے ہو گیا دل سرد — دیکھ کر رنگ عالم فانی
کچھ نہیں جز طلسم خواب و خیال — گوشۂ فقر و بزم سلطانی
ہے سراسر فریب وہم و گماں — تاج فغفور و تخت خاقانی
بے حقیقت ہے شکل موج سراب — جام جمشید و راح ریحانی
لفظ مہمل ہے نطق اعرابی — حرف باطل ہے عقل یونانی
ایک دم ہو کہاں لحن داؤدی — اک تماشا ہے حسن کنعانی
نہ کروں تشنگی میں تر لب خشک — چشمۂ خضر کا ہو گر پانی
لوں نہ اک مشت خاک کے بدلے — گر ملے خاتم سلیمانی

بحر ہستی بجز سراب نہیں
چشمۂ زندگی میں آب نہیں

جس سے دنیا نے آشنائی کی — اس سے آخر کو کج ادائی کی
تجھ پہ پھولے کوئی عبث اے عمر — تو نے کی جس سے بیوفائی کی
ہے زمانہ وفا سے بیگانہ — ہاں قسم مجھ کو آشنائی کی
یہ وہ بے مہر ہے کہ ہے اس کی — صلح میں چاشنی لڑائی کی
ہے یہاں حظ وصل سے محروم — جس کو طاقت نہ ہو جدائی کی
ہے یہاں حفظ وضع سے مایوس — جس کو عادت نہ ہو گدائی کی
خندۂ گل سے بے بقا تر ہے — شان ہو جس میں دلربائی کی

جنس کاسد سے نا روا تر ہے
خوبیاں جس میں ہوں خدائی کی

بات بگڑی رہی سہی افسوس
آج خاقانی و سنائی کی

رشک عرفی و فخر طالب مُرد
اسد اللہ خانِ غالب مُرد

بلبل ہند مر گیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں اک بات

نکتہ داں نکتہ سنج نکتہ شناس
پاک دل پاک ذات پاک صفات

شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج
رند اور مرجع کرام و ثقات

لاکھ مضمون اور اسکا ایک ٹھول
سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

دل میں چبھتا تھا وہ اگر بمثل
دن کو کہتا دن اور رات کو رات

ہوگیا نقش دل پہ جو لکھا
قلم اُس کا تھا اور اس کی بات

تھیں تو دلی میں اُسکی باتیں تھیں
لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات

اس کے مرنے سے مرگئی دلی
خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

یہاں اگر بزم تھی تو اسکی بزم
یہاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

دل کی باتیں جب اس کی یاد آئیں
کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں

کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل
کس سے دادِ سخنوری پائیں

مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب
کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں

پست مضموں ہے نوحۂ استاد
کس طرح آسماں پہ پہونچائیں

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں
اہل میت جنازہ ٹھہرائیں

لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو
سوے مدفن ابھی نہ لے جائیں

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح
اہل انصاف غور فرمائیں

قدسی و صائب و اسیر و کلیم
لوگ جو چاہیں اُن کو ٹھہرائیں

ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

غالبِ نکتہ داں سے کیا مطلب
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

نثر حسن و جمال کی صورت
نظم غنج و دلال کی صورت

تہنیت اک نشاط کی تصویر
تعزیت اک ملال کی صورت

قال اس کا وہ آئینہ جس میں
نظر آتی تھی حال کی صورت

اس کی توجیہ سے پکڑتی تھی
شکل امکاں محال کی صورت

اس کی تاویل سے بدلتی تھی
رنگ ہجراں وصال کی صورت

لطف آغاز سے دکھاتا تھا
سخن اس کا مآل کی صورت

چشم دوراں سے آج چھپتی ہے
انوری و کمال کی صورت

لوح امکاں سے آج مٹتی ہے
علم و فضل و کمال کی صورت

دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے
غالبِ بے مثال کی صورت

اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈھے نہ پائیں گے یہ لوگ

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج
اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج

نازشِ خلق کا محل نہ رہا
رحلتِ فخرِ روزگار ہے آج

تھا زمانہ میں ایک رنگیں طبع
رخصتِ موسمِ بہار ہے آج

بارِ احباب جو اُٹھاتا تھا
دوشِ احباب پر سوار ہے آج

تھی ہر ایک بات نیشتر جس کی
اس کی چپ سے جگر فگار ہے آج

دل میں مدت سی تھی خلش جسکی
وہی برچھی جگر کے پار ہے آج

دلِ مضطر کو کون دے تسکیں
ماتمِ یارِ غمگسار ہے آج

تلخئ غم کہیں نہیں جاتی
جانِ شیریں بھی ناگوار ہے آج

کس کو لاتے ہیں بہرِ دفن کہ قبر
ہمہ تن چشمِ انتظار ہے آج

غم سے بھرتا نہیں دلِ ناشاد
کس سے خالی ہوا جہاں آباد

نقدِ معنی کا گنجداں نہ رہا
خوانِ مضموں کا میزباں نہ رہا

ساتھ اس کے گئی بہارِ سخن
اب کچھ اندیشۂ خزاں نہ رہا

ہوا ایک ایک کارواں سالار
کوئی سالارِ کارواں نہ رہا

رونق حسن تھا بیاں اس کا
گرم بازار گل رخاں نہ رہا

عشق کا نام اس سے روشن تھا
قیس و فرہاد کا نشاں نہ رہا

ہو چکیں حسن و عشق کی باتیں
گل و بلبل کا ترجماں نہ رہا

اہل ہند اب کریں گے کس پر ناز
رشک شیراز و اصفہاں نہ رہا

زندہ کیونکر رہے گا نام ملوک
بادشاہوں کا مدح خواں نہ رہا

کوئی ویسا نظر نہیں آتا
وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

اُٹھ گیا۔ تھا جو مایہ دار سخن
کس کو ٹھہرائیں اب مدار سخن

کیا ہے جس میں وہ مردِ کار نہ تھا
اک زمانہ کہ سازگار نہ تھا

شاعری کا کیا حق اس نے ادا
پر کوئی اس کا حق گزار نہ تھا

بے صلہ مدح و شعر بے تحسین
سخن اس کا کسی پہ بار نہ تھا

ق

نذر سائل تھی جان تک لیکن
در خورِ ہمت اقتدار نہ تھا

م

ملک و دولت سے بہرہ ور نہ ہوا
جان دینے پہ اختیار نہ تھا

خاکساروں سے خاکساری تھی
سربلندوں سے انکسار نہ تھا

لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلا
دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا

بے ریائی تھی زہد کے بدلے
زہد اس کا مگر شعار نہ تھا

ایسے پیدا کہاں ہیں مست خراب
ہم نے مانا کہ ہوشیار نہ تھا

مظہر شان حسن فطرت تھا
معنی لفظ آدمیت تھا

کچھ نہیں فرق باغ و زنداں میں — آج بلبل نہیں گلستاں میں
شہر سارا بنا ہے بیت حزن — ایک یوسف نہیں جو کنعاں میں
ملک اکثر ہوا ہے بے آئین — اک فلاطوں نہیں جو یوناں میں
ختم تھی اک زباں پہ شیرینی — ڈھونڈھتے کیا ہو سیب دُرّماں میں
حصر تھی اک بیاں میں رنگینی — کیا دھرا ہے عقیق مرجاں میں
لب جادو بیاں ہوا خاموش — گوش گل وا ہے کیوں گلستاں میں
گوش معنی شنو ہوا بے کار — مرغ کیوں نعرہ زن ہے بستاں میں
وہ گیا جس سے بزم روشن تھی — شمع جلتی ہے کیوں شبستاں میں
نہ رہا جس سے تھا فروغ نظر — سرمہ بنتا ہے کیوں صفاہاں میں

ماہ کامل میں آ گئی ظلمت
آب حیواں پہ چھا گئی ظلمت

ہند میں نام پائے گا اب کون — سکہ اپنا بٹھائے گا اب کون
ہم نے جانی ہے اس سے قدر سلف — ان پہ ایمان لائے گا اب کون
اس نے سب کو بھلا دیا دل سے — اس کو دل سے بھلائے گا اب کون
تھی کسی کی نہ جس میں گنجائش — وہ جگہ دل میں پائیگا اب کون

اُس سے ملنے کو یہاں ہم آئے تھے
جا کے دلّی سے آئے گا اب کون

مر گیا قدر دانِ فہم سخن
شعر ہم کو سُنائے گا اب کون

مر گیا تشنۂ مذاق کلام
ہم کو گھر سے بلائے گا اب کون

تھا بساطِ سخن میں شاطر ایک
ہم کو چالیں بتائے گا اب کون

شعر میں ناتمام ہے حالیؔ
غزل اس کی بنائے گا اب کون

کم لنا فیہ من بکی و عویل
و عتاب مع الزمان طویل

چُپ کی داد

اے ماؤ بہنو بیٹیو! دُنیا کی زینت تم سے ہے
مُلکوں کی بستی ہو تمہیں قوموں کی عزّت تم سے ہے

تُم گھر کی ہو شہزادیاں۔ شہروں کی ہو آبادیاں
غمگیں دلوں کی شادیاں دُکھ سُکھ میں راحت تم سے ہے

تم ہو تو غربت ہے وطن تم بن ہے ویرانہ چمن
ہو دیس یا پردیس جینے کی حلاوت تم سے ہے

نیکی کی تم تصویر ہو عفت کی تم تدبیر ہو

ہو دین کی تم پاسباں ایماں سلامت تم سے ہے

فطرت تمہاری ہے حیا طینت میں ہے مہر و وفا

گھٹی میں ہے صبر و رضا۔ انساں عبارت تم سے ہے

مردوں میں ست والے تھے جو ست بیٹھے اپنا کب کا کھو

دنیا میں اے ستونتیو! لے دے کے اب ست تم سی ہے

مونس ہو خاوندوں کی تم غمخوار فرزندوں کی تم

تم بن ہے گھر ویران سب گھر بھر میں برکت تم سی ہے

تم آس ہو بیمار کی۔ ڈھارس ہو تم بےکار کی

دولت ہو تم نادار کی عُسرت میں عشرت تم سے ہے

آتی ہو اکثر بے طلب۔ دُنیا میں جب آتی ہو تم

پر موہنی سے اپنی یہاں گھر بھر پہ چھا جاتی ہو تم

میکے میں سارے گھر کی تھیں۔ گو مالک و مختار تم

پر سارے کنبے کی رہیں بچپن سے خدمتگار تم

ماں باپ کے حکموں پہ تیلی کی طرح پھرتی رہیں

غمخوار بابیوں کی رہیں۔ ماؤں کی تابعدار تم

دن بھر پکانا ریندھنا سینا پرونا تاگنا

بیٹھیں نہ گھر پر باپ کے۔ خالی کبھی زنہار تم
راتوں کو چھوٹے بھائی بہنوں کی خبر اُٹھ اُٹھ کے لی
بچہ کوئی سوتے میں رویا اور ہوئیں بیدار تم
سسرال میں پہونچیں تو وہاں۔ اک دوسرا دیکھا جہاں
جا اتریں گویا دیس سے۔ پردیس میں اکبار تم
وہاں فکر تھی ہر دم یہی۔ ناخوش نہ ہو تم سے کوئی
اپنے سے رنجش کے کبھی۔ پاؤ نہ وہاں آثار تم
بدلے نہ شوہر کی نظر۔ سسرے کا دل میلا نہ ہو
آنکھوں میں ساس اور نند کی کھٹکو نہ مثلِ خار تم
پالا بڑوں سے گر پڑے۔ بدخو ہوں سب چھوٹے بڑے
چتون پہ میل آنے نہ دو۔ گو دل میں ہو بیزار تم
غم کو غلط کرتی رہو۔ سسرال میں ہنس بول کر
شربت کے گھونٹوں کی طرح پیتی رہو خونِ جگر
شادی کے بعد ایک ایک کو۔ تھی آرزو اولاد کی
تم پھنس گئیں جنجال میں۔ خالق نے جب اولاد دی
دردوں کے دُکھ تم نے سہے جاپے کی جھیلیں سختیاں
جب موت کا چکھا مزا۔ تب تم کو یہ دولت ملی

میکے میں اور سسرال میں۔ سب کے ہوے دِل باغ باغ
گھر میں اُجالا تو ہوا۔ پر تم پہ بپتا پڑ گئی
کھانا پینا اوڑھنا اپنا گئیں سب بھول تم
بچّوں کے دھندے میں تمہیں۔ اپنی نہ کچھ سُدھ بُدھ رہی
تب تک بھی کچھ خیر تھی۔ جب تک بھلے چنگے تھے سب
پر سامنا آفت کا تھا۔ گر ہو گیا ماندہ کوئی
سولی پہ دن کٹنے لگے۔ راتوں کی نیندیں اُڑ گئیں
اک اک برس کی ہو گئی۔ ایک ایک پل اِک اِک گھڑی
بچّوں کی سیوا میں تمہیں گزرے ہیں جیسے دس برس
قدر اسکی جانے گا وہی۔ دم پر ہو یوں جس کے بنی
کی ہے مہم جو تم نے سر۔ مَردوں کو اس کی کیا خبر
جانے پرائی پیر وہ جس کی بوائی ہو پھٹی
تھا پالنا اولاد کا مَردوں کے بوتے سے سوا
آخر یہ اے دُکھیاریو! خدمت تمہارے سر پڑی
پیدا اگر ہوتیں نہ تم بیڑا نہ ہوتا پار یہ
چیخ اُٹھتے دو دن میں۔ اگر مردوں پہ پڑتا بار یہ

بیتیں خبر اولاد کی۔ مائیں نہ گر چھٹپن میں یہاں
خالی کبھی کا نسل سے آدم کے ہو جاتا جہاں

یہ گوشت کا ایک لوتھڑا۔ پروان چڑھتا کس طرح
چھاتی سے لپٹائے نہ ہر دم رکھتی گر بچے کو ماں

وہ دین اور دُنیا کے مصلح جن کے وعظ اور پند سے
ظلمت میں باطل کی ہوا دُنیا میں نورِ حق عیاں

وہ علم اور حکمت کے بانی جن کی تحقیقات سے
ظاہر ہوئے عالم میں اسرار زمین و آسماں

وہ شاہ کشور گیر اسکندر کہ جس کی دھاک سے
تھے بید کے مانند لرزاں تاج داران جہاں

وہ فخر شاہانِ عجم کسریٰ کہ جس کے عدل کی
مشرق سے تا مغرب زبانوں پر ہے جاری داستاں

کیا پھول پھل یہ سب انھیں کے پودوں کے نہ تھے؟
سینچا تھا ماؤں نے جنھیں خون جگر سے اپنے یہاں

کیا صوفیانِ با صفا کیا عارفانِ با خدا
کیا انبیا کیا اولیا کیا غوث کیا قطب زماں

سرکار سے مالک کی جتنے پاک بندے ہیں بڑھے

وہ ماؤں کی گودوں کے زینے سے ہیں سب اوپر چڑھے

افسوس دُنیا میں بہت تم پر ہوئے جور و جفا

حق تلفیاں تم نے سہیں بے مہریاں جھیلیں سدا

اکثر تمہارے قتل پر قوموں نے باندھی ہے کمر

دیں تاکہ تم کو یک قلم۔ خود لوحِ ہستی سے مٹا

گاڑی گئیں تم مدتوں۔ مٹی میں جیتی جاگتی

حامی تمہارا تھا نہ یاور کوئی جز ذاتِ خدا

زندہ سدا جلتی رہیں۔ تم مردہ خاوندوں کے ساتھ

اور چین سے عالم رہا یہ سب تماشے دیکھتا

بیاہی گئیں اس وقت تم جب بیاہ سے واقف نہ تھی

جو عمر بھر کا عہد تھا وہ کچے دھاگے سے بندھا

بیاہا تمہیں ماں باپ نے اے بے زبانوں اس طرح

جیسے کسی تقصیر پر مجرم کو دیتے ہیں سدا

گذری امید و بیم میں جب تک رہا باقی سُہاگ

بیوہ ہوئیں تو عمر بھر پھر چین قسمت میں نہ تھا

تم سخت سے سخت امتحاں دیتی رہیں پر رائیگاں

کیں تم نے جانیں تک فدا کہلائیں لیکن بے وفا

گو صبر کا اپنے نہ کچھ تم کو ملا انعام یہاں
پر جو فرشتہ نہ ہو وہ کر گئیں تم کام یہاں

کی تم نے اس دار المحن میں جس تحمل سے گذر
زیبا ہے گر کہئے تمہیں فخر بنی نوع بشر
جو سنگ دل سفاک پیاسے تھے تمہارے خون کے
اُن کی تو ہیں بے رحمیاں مشہور عالم میں مگر
تم نے تو چین اپنے خریداروں سے بھی پایا نہ کچھ
شوہر ہوں اس میں یا پدر یا ہوں برادر یا پسر
الفت تمہاری کر گئی گھر دل میں جس بے دید کے
وہ بدگماں تم سے رہا اے بے نصیبو عمر بھر
گو نیک مرد اکثر تمہارے نام کے عاشق رہے
پر نیک ہوں یا بد رہے سب متفق اس رائے پر
جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یہاں
آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر
تم اس طرح مجہول اور گم نام دنیا میں رہو
ہو تم کو دنیا کی نہ دنیا کو تمہاری ہو خبر
جو علم مردوں کے لئے سمجھا گیا آب حیات

ٹھہرا تمہارے حق میں وہ زہر ہلاہل سر بسر

آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب

دُنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا وہاں جواب

گذرے تھے جگ تم پہ کہ ہمدردی نہ تھی تم سے کہیں

تھا منحرف تم سے فلک برگشتہ تھی تم سے زمیں

دُنیا کے دانا اور حکیم اس خوف سے لرزاں تھے سب

تم پہ مبادا علم کی پڑ جائے پرچھائیں کہیں

ایسا نہ ہو مرد اور عورت میں رہے باقی نہ فرق

تعلیم پا کر آدمی بننا تمہیں زیبا نہیں

یہاں تک تمہاری ہجو کے گائے گئے دُنیا میں راگ

تم کو بھی دُنیا کی کہن کا آگیا آخر یقیں

علم و ہنر سے رفتہ رفتہ ہوگئیں مایوس تم

سمجھا لیا دل کو کہ ہم خود علم کے قابل نہیں

جو ذلتیں لازم ہیں دُنیا میں جہالت کے لئے

وہ ذلتیں سب نفس پر اپنے گوارا تم نے کیں

سمجھا نہ تم کو ایک دن مردوں نے قابل بات کے

تم بیویاں کہلائیں لیکن لونڈیاں بن کر رہیں
آخر تمہاری چپ دلوں میں اہل دل کے چبھ گئی
سچ ہی کہ چپ کی داد آخر بے ملے رہتی نہیں
بارے زمانہ نیند کے ماتوں کو لایا ہوش میں
آیا تمہارے صبر پہ دریائے رحمت جوش میں

نوبت تمہاری حق رسی کی بعد مدت آئی ہے
انصاف نے دھندلی سی ایک اپنی جھلک دکھلائی ہے
گو ہے تمہارے حامیوں کو مشکلوں کا سامنا
پر حل ہر اک مشکل یوں ہی دنیا میں ہوتی آئی ہے
اٹکے ہیں روڑے چلتی گاڑی میں سچائی کے سدا
پر فتح جب پائی۔ سچائی ہی نے آخر پائی ہے

ڈاکٹر محمد اقبال

پیدائش سیالکوٹ ۱۸۷۰ء

ڈاکٹر محمد اقبال ۱۸۷۰ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ اپنے قصبہ کے اسکول کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم پاکر۔ ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ کچھ روز اسی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر رہے بعد ازاں انگلستان تشریف لے گئے وہاں سے بیرسٹر اور فلسفہ کے ڈاکٹر ہو کر آئے واپسی کے بعد بھی کچھ دنوں گورنمنٹ کالج میں پروفیسر رہے اب صرف بیرسٹری کرتے ہیں اور لاہور کے مسلمان کشمیریوں کی انجمن کے سکریٹری ہیں۔ شاعری کا شوق ابتدا سے تھا سب سے پہلے ۱۸۹۹ء میں لاہور کی انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ پر ایک نظم نالۂ یتیم پڑھی جس میں مسلمان یتیم بچوں کی مدد کے لئے اپیل کی گئی تھی انجمن حمایت اسلام یا اسلامی جلسوں کے سوا معمولی مشاعروں میں نظم نہیں پڑھتے۔ ابتدا میں چند غزلیں مرزا ارشد گورگانی دہلوی کو دکھائی تھیں اور کسی وقت داغ مرحوم سے بذریعہ خط وکتابت تلمذ اختیار کیا تھا فارسی کے شاعر نہیں مگر عالم ضرور ہیں اور جب کبھی شاذونادر فارسی کہتے ہیں تو اچھی کہتے ہیں۔ پروفیسر اقبال آج کل کے ان چند شاعروں میں ہیں جو اُردو میں یورپ کے نئے خیالات کامیابی کے ساتھ ظاہر کرسکتے ہیں یعنی جو خیالات

جدید کو اپنے مضامین میں تو ضرور جگہ دیتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ اُردو شاعری کے آئین اور اُردو زبان کی پاکیزگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ آپ کے کلام کی تخصیص یہ ہے کہ شاعرانہ لطافت کے ساتھ فلسفیانہ مضامین کی بھی جھلک نظر آتی ہے۔ پنجاب کو آپ کی ذات پر فخر ہے۔ آپ کی نظمیں اکثر لاہور کے مشہور رسالہ مخزن میں شایع ہوتی رہتی ہیں۔ ذیل کا اقتباس اسی رسالہ کے مختلف نمبروں سے کیا گیا ہے۔

ہمارا دیس

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اُسکی یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اسکی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

اے آبِ رود گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو
اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان مصر روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبالؔ کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

جگنو

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں

تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرّہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

حُسنِ قدیم کی یہ پوشیدہ اک جھلک تھی
لے آئی جس کو قدرت خلوت سے انجمن میں

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

پروانہ اک پتنگا جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا جویا یہ روشنی سراپا

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی
پروانے کو تپش دی جگنو کو روشنی دی

رنگیں نوا بنایا مرغانِ بے نوا کو
گُل کو زبان دے کر تسلیم خامشی دی

نظارۂ شفق کی خوبی زوال میں تھی
چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی زندگی دی

رنگیں کیا سحر کو بانکی دُلھن کی صورت
پہنا کے لال جوڑا شبنم کو آرسی دی

سایہ دیا شجر کو پرواز دی ہوا کو
پانی کو دی روانی موجوں کو بیکلی دی

اک مشتِ گل میں رکھا احساس کا شرارہ
انساں کو آگہی کیا ظلمت کو چاندنی دی

یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری
جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری

حُسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وہ سخن ہی غنچے میں وہ چٹک ہے

یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کُچھ یاں درد کی کسک ہے

انداز گفتگو نے دھوکے دئے ہیں ورنہ
نغمہ ہے بوئے بُلبل، بُو پھول کی چہک ہے

کثرت میں ہوگیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شے میں جب کہ پنہاں خاموشیِ ازل ہو

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آ کے مَیں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا۔ چھوڑے ترے فسانے

کچھ فکر پھوٹ کی کر مالی ہے تو چمن کا
بوٹوں کو پھونک ڈالا اس بِس بھری ہوا نے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مُجھکو ہر ذرّہ دیوتا ہے

آ مل کے غیریت کے پردوں کو پھر اُٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدّت سے جی کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دُنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں

پھر اک انوپ ایسی سونے کی مورتی ہو
اس ہردوار دل میں لاکر جسے بٹھا دیں

سندر ہو اس کی صورت چھب اسکی موہنی ہو
اس دیوتا سے مانگیں جو دل کی ہو مرادیں

زنار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو
یعنی صنم کدے میں شانِ حرم دکھا دیں

پیلو کو چیر ڈالیں درشن ہو عام اس کا
ہر آتما کو گویا اک آگ سی لگا دیں

آنکھوں کی ہے جو گنگا لے کے اسے یا پانی
اس دیوتا کے آگے اک نہر سی بہا دیں

"ہندوستان" لکھ دیں ماتھے پہ اس صنم کے
بھولے ہوئے ترانے دُنیا کو پھر سُنا دیں

ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

مندر میں ہو بلانا جس دم پجاریوں کو
آوازۂ اذاں کو ناقوس میں چھپا دیں

اگنی ہے وہ جو نرگن کہتے ہیں پیت جس کو
دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ سے جلا دیں

ہے ریت عاشقوں کی تن من نثار کرنا
رونا ستم اُٹھانا اور ان کو پیار کرنا

پنڈت برج نراین چکبست

غزلوں کا انتخاب

دل کئے تسخیر بخشا فیضِ روحانی مجھے
حُبِّ قومی ہو گیا نقشِ سلیمانی مجھے

کلفتِ دُنیا مٹے بھی تو سخی کے فیض سے
ہاتھ دھونے کو ملے بہتا ہوا پانی مجھے

خود پرستی مٹ گئی قدرِ محبت بڑھ گئی
ماتمِ احباب ہے تعلیمِ روحانی مجھے

ذرہ ذرہ ہے مرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

عزیزانِ وطن کو غنچہ و برگ و ثمر جانا
خدا کو باغباں اور قوم کو ہم نے شجر جانا

مصیبت میں بشر کے جوہرِ مردانہ کھُلتے ہیں
مبارک بُزدلوں کو گردشِ قسمت سے ڈر جانا

اجل کی نیند میں بھی خواب ہستی گر نظر آیا
تو پھر بیکار ہے تنگ آ کے اس دُنیا سے مر جانا

وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انسان سہتا ہے
نہیں تو ہے بہت آسان اس جینے سے مر جانا

چمن زارِ محبت میں اسی نے باغبانی کی
کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا

وہ طبعِ یاس پرور نے مجھے چشمِ عقیدت دی
کہ شامِ غم کی تاریکی کو بھی نورِ سحر جانا

درد دل پاس وفا جذبۂ ایماں ہونا — آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا
زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب — موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا
دفترِ حسن پہ مہرِ یدِ قدرت سمجھو — پھول کا خاک کے تودہ سے نمایاں ہونا
گُل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک — ہے اسے طُرّۂ دستارِ غریباں ہونا

نہ کوئی دوست دشمن ہو شریکِ دردِ غم میرا — سلامت میری گردن پر رہے بارِ الم میرا
لکھا یہ داورِ محشر نے میری فردِ عصیاں پر — یہ وہ بندہ ہے جس پر ناز کرتا ہے کرم میرا
کہا غنچہ نے ہنس کر واہ کیا نیرنگِ عالم ہے — وجودِ کل جسے سمجھے ہیں سب ہے وہ عدم میرا
دلِ احباب میں گھر ہے شگفتہ رہتی ہے خاطر — یہی جنت ہے میری اور یہی باغِ ارم میرا
متاعِ دردِ دل اک دولتِ بیدار ہے ہم کو — دُرِ شہوار ہے اشکِ وفا ہیں چشمِ غم میرا
رہی ہے ایک ترکِ آرزو کی آرزو باقی — اسی پر ختم ہے افسانۂ درد و الم میرا
زبانِ حال سے یہ لکھنؤ کی خاک کہتی ہے — مٹایا گردشِ افلاک نے جاہ و حشم میرا
کیا ہے فاش پردہ کفر و دیں کا اس قدر میں نے — کہ دشمن ہے برہمن اور عدو شیخِ حرم میرا

رامائن کا ایک سین

(راجہ رام چندر جی کا ماں سے رخصت ہونا)

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام — راہِ وفا کی منزلِ اوّل ہوئی تمام

منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام
دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
آخر ہے کچھ حدِ ستم و ظلم و جور بھی
ہم کو اداس دیکھ کے غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ خوش خصال
خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتہ سا ہوگیا ہے یہ ہے شدتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بیگناہ
نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ
لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ
چہرہ کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیرِ یاس کا قفلِ دہن کھلا
افسانۂ شدائدِ رنج و محن کھلا
اک دفترِ مظالمِ چرخِ کہن کھلا
وا تھا دہانِ زخم کہ بابِ سخن کھلا
دردِ دلِ غریب جو صرفِ بیاں ہوا
خونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں
میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں
لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں

کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دُلارے کو بھیج دوں

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سپید
اندھا کئے ہوئے ہے زر و مال کی اُمید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید
سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثال بید

لکھی ہے کیا حیاتِ ابد اُن کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم
ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم
تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم

میں خوش ہوں پھونک دے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگاؤں گی راج کو

کن کن ریاضتوں سے گزارے ہیں ماہ و سال
دیکھی تمہاری شکل جب اے میرے نونہال
لائے دولھن بیاہ کے شادی ہوئی کمال
آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال

چھٹتی ہوں اُن سے جوگ لیا جن کے واسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کے واسطے

ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر
گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخلِ تمنا جو بے ثمر
یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر

لہ بھرت جی کی ماں کیکئی کی طرف اشارہ ہے جنکی ضد سے مجبور ہو کر راجہ دسرتھ نے رامچندر جی کو بن باس کا حکم دیا تھا اور بھرت جی کو اپنا ولیعہد مقرر کیا تھا

لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغ تمنا اُجڑ گیا

سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ
آتی نظر نہیں کوئی امن و اماں کی راہ
منجھدار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ
اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ

تقصیر میری خالقِ عالم بحل کرے
آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

سُن کر زباں سے ماں کی یہ فریاد درد خیز
عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز
اُس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز
لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز

سوچا یہی کہ جان سے بے کس گزر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور
صدمہ یہ شاق عالمِ پیری میں ہے ضرور
مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیوں وفور
لیکن نہ دل سے کیجئے صبر و قرار دور

شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

یہ جعل یہ فریب یہ سازش یہ شور و شر
اسباب ظاہری ہیں نہ ان پر کرو نظر
ہونا جو ہے سب اُس کے بہانے ہیں سر بسر
کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر

خاص اُس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اُسے ہے کوئی جانتا نہیں

راحت ہو یا کہ رنج خوشی ہو کہ انتشار
تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگ روزگار
واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکرِ کردگار
ماتم کدہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار

سختی سہی نہیں کہ اُٹھائی کڑی نہیں
دُنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں

دیکھیں ہیں اس سے بڑھ کے زمانے نے انقلاب
سوزِ دروں سے قلب و جگر ہو گئے کباب
جن سے کہ بیگناہوں کی عمریں ہوئیں خراب
پیری مٹی کسی کی کسی کا مٹا شباب

کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے
وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اُجڑ گئے

ماں باپ منہ ہی دیکھتے تھے جن کا ہر گھڑی
دامن پہ جن کے گرد بھی اُڑ کر نہیں پڑی
قائم تھیں جن کے دم سے اُمیدیں بڑی بڑی
ماری نہ جن کو خواب میں بھی پھول کی چھڑی

محروم جب وہ گُل ہوئے رنگِ حیات سے
اُن کو جلا کے خاک کیا اپنے ہات سے

کہتے تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال
ہے کبریا کی شان گزرتے ہی ماہ و سال
ان بیکسوں کی جان کا بچنا ہے اب محال
خود دل سے دردِ ہجر کا مٹتا گیا خیال

ہاں کچھ دنوں تو نوحۂ و ماتم ہوا کیا
آخر کو رو کے بیٹھ رہے اور کیا کیا

پڑتا ہے جس غریب پہ رنج و محن کا بار
کرتا ہے اُس کو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انساں گناہگار
یہ جانتے نہیں وہ ہے دانائے روزگار
انسان اُس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امر رضا میں جو خم رہے

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام
بعد سفر وطن میں ہم آئیں گے شادکام
ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام
قائم اُمید ہی سے ہے دنیا ہے جس کا نام
اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں
ہے دن کی دھوپ رات کی شبنم انھیں گراں
لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگہاں
وہ گل ہزار پردوں میں جاتے ہیں رائگاں
رکھتے ہیں جو عزیز انھیں اپنی جاں کی طرح
ملتے ہیں دست یاس وہ برگ خزاں کی طرح

لیکن جو پھول کھلتے ہیں صحرا میں بے شمار
موقوف کچھ ریاض پہ اُن کی نہیں بہار
دیکھو یہ قدرتِ چمن آرائے روزگار
وہ ابر و باد و برف میں رہتے ہیں برقرار

ہوتا ہے اُن پہ فضل جو ربِّ کریم کا
موجِ سموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا

اپنی نگاہ ہے کرمِ کارساز پر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر

صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر
رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بے خبر

اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامانِ دشت دامنِ مادر سے کم نہیں

دولت

کہتے تھے برازر کو سخن سنج پُرانے
وہ فلسفہ و علم و ادب اب ہیں فسانے

اُن لوگوں کے ہمراہ گئے اُن کے زمانے
بدلا ہے نیا رنگ زمانے کی ہوا نے

دولت سے ہی اب زینتِ کاشانۂ تہذیب
کہتے ہیں اسے شمع جلو خانۂ تہذیب

مٹ جانے پہ بھی نام و نشاں رہتا ہی اس سے
تازہ چمن تاب و تواں رہتا ہے اس سے

سرچشمۂ امید رواں رہتا ہے اس سے
پیری میں بھی انسان جواں رہتا ہے اس سے

ہر رنگ میں یہ تازگی قلب و جگر ہے
ہے صلح میں شمشیر و لڑائی میں سپر ہے

کوشش کبھی زردار کی جاتی نہیں بے سود
رہتا ہے سدا سایہ فگن طالع مسعود

انسان کی نیت میں اگر شر نہ ہو موجود　　زر ہاتھ میں اس کے ہی کلیدِ درِ مقصود

کب گو ہرِ امید کو رولا نہیں اس نے
تھا کونسا در بند جو کھولا نہیں اس نے

ہوں طالب تحقیق کہ دل دادۂ تعلیم　　خم سامنے دولت کے ہی سب کا سرِ تسلیم
سنتے ہیں انھیں کے لئے ہی کوثر و تسنیم　　یاں جو رہِ مولا میں لٹاتے ہیں زر و سیم

دنیا ہی میں کچھ ذکر نہیں تازہ ہوا اس کا
دربار میں اللہ کے آوازہ ہے اس کا

لیکن وہ زر و مال نہیں قابلِ تحسین　　انساں کو بنا دے جو تکبر پرور و خود بیں
زردار وہ ہے جس میں شرافت کی ہوں آئیں　　ہو بزم محبت کے لئے باعثِ تزئین

سرسبز رہے قوم یہ انعام ہوا اس کا
باراں کی طرح فیض و کرم عام ہوا اس کا

مانا ہوسِ زر ہے بشر کے لئے عادت　　لیکن نہیں دنیا میں فقط اک یہی نعمت
کچھ اور بھی جوہر ہیں عطا کردۂ قدرت　　غمخواری و دلجوئی و ہمدردی و الفت

زر آپ نہیں دشمن اخلاق و ادب ہے
جو حد سے گذر جاتی ہے وہ اس کی طلب ہے

جو لوگ ہی حرص سے دنیا میں ہیں سرشار　　جینے کی لطافت سے نہیں ان کو سروکار
مانند گدا زر کے ہیں ہر وقت طلبگار　　آزاد کہاں دام طمع میں ہیں گرفتار

محروم مئے عیش سے یہ خستہ جگر ہیں
مالک نہیں زر کے ہیں فقط بندۂ زر ہیں

دولت وہ ہے مجبور کی جو عقدہ کشا ہو
آئینۂ اخلاق و محبت کی جلا ہو

اکسیر ہو دردِ دلِ بیکس کی دوا ہو
ظلمات فلاکت کے لئے آبِ بقا ہو

یوں فیض کے چشمے ہوں رواں باغ وطن میں
جیسے کرم ابر گہربار چمن میں

ہر صبح گلستاں میں بصد شان فصاحت
دیکھو چمن آرائے دو عالم کی عنایت

بلبل گل رنگیں سے یہ کرتی ہے حکایت
گھٹتی کبھی دیکھی نہیں فیاض کی دولت

گو گوہر خوش آب لٹانا نہیں ہوتا
خالی کبھی شبنم کا خزانہ نہیں ہوتا

مانا سبب شوکت و اجلال ہے دولت
ادنیٰ سے ملے جھک کے یہ اعلیٰ کی ہے عظمت

پر مفلس بیکس بھی نہیں قابل نفرت
بس نشۂ زر سے نہ جھکے چشم مروت

ہے کبر اسے شان امارت نہیں کہتے
کچھ کہئے اسے حسن شرافت نہیں کہتے

کس اوج پہ خورشید جہانتاب ہے معمور
گو خاک نہیں ذرۂ ناچیز کا مقدور

دل تیرگی کبر سے کوسوں ہے مگر دور
دیتا ہے اسے جام سے اپنے وہ مئے نور

یا ماہ کا اس اوج پہ کیا فیض عیاں ہے

ہر خانۂ مفلس کے لئے شمع مکاں ہے

یا باغ میں کھلتا ہے دم صبح گل تر
بنتا ہے عروسان جہاں کے لئے زیور

کیا کیا اسے ہوتے نہیں اعزاز میسّر
دستار میں نوشہ کی رہا کرتا ہے اکثر

لیکن نہ کسی وضع پہ اس ڈھنگ سے دیکھا
بیکس کی لحد پر اسے جس رنگ سے دیکھا